ماہنامہ

اشراق

لاہور

اکتوبر ۲۰۲۴ء

1979 سے جاری شدہ

اشاعت کے 46 سال

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

طالب محسن

مدیر انتظامی

جواد احمد غامدی

”انسان وارفتۂ حسن ہے، اور اِن سب چیزوں کا حسن جہاں اپنے منتہاے کمال پر ظاہر ہوگا، وہ فردوس بریں ہے۔ چنانچہ انسان کا نصب العین بھی وہی ہے، اور اُس کے لیے وہ محبت کے غیر معمولی جذبات اور اُس کو پالینے کی شدید خواہش کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اُس کی تمام جدوجہد کا مقصود بھی ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اِس کو کسی نہ کسی درجے میں اپنے لیے فردوس بنا لینے میں کامیاب ہو جائے۔ وہ اِسی مقصد سے جیتا، اِسی کے لیے مرتا، اِسی کے لیے رہنماؤں کے بت تراشتا، اُن کی پرستش کرتا، اُن کے دکھائے ہوئے خوابوں کو حقیقت بنا دینے کے لیے جان و مال کی قربانی پیش کرتا اور آنے والے زمانوں میں کبھی اساطیر اور کبھی علم کے تراشیدہ مسیحاؤں کا منتظر رہتا ہے۔ پھر یہی نہیں، اِس سے آگے وہ اپنی اِس جدوجہد کے حق میں فلسفے بھی ایجاد کر ڈالتا ہے۔“ —— شذرات

- محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز کیا تو قبل از اسلام کا زمانہ ’زمانۂ جاہلیت‘ کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسلام سے پہلے عرب بالکل کوئی حیوانوں کا ریوڑ تھے۔ اس سے مراد یہ تھی کہ عرب خالص حق سے محروم تھے۔ (شذرات)
- قرآن ناظرہ کے ساتھ جڑا ہوا ثواب کا تصور وہ ... چیز ہے جسے ہم نے اپنے اور قرآن کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل کر رکھا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ نہ تو ناظرہ قرآن کے پڑھنے میں کوئی حرج ہے اور نہ ہی اس کلام کے الفاظ کی تلاوت سے ملنے والے ثواب سے کوئی انکار کر سکتا ہے، لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ یہی نیکی، اور نیکی کا یہ تصور ہمارے لیے قرآن سے دوری کا سبب بن رہے ہیں۔ (اصلاح و دعوت)

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور
زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۶ شمارہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۲۴ء ربیع الثانی ۱۴۴۶ھ

فہرست

شذرات

دین فطرت	جاوید احمد غامدی	۴
رسول اللہ کی سرگذشت	طالب محسن	۷

قرآنیات

البیان: الزمر ۳۹: ۵۳-۷۵ (۴)	جاوید احمد غامدی	۱۲

معارف نبوی

بعثت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اور آپ کا زمانۂ رسالت	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۲۰

مقالات

'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ'؟ (۷)	ساجد حمید	۲۷

سیر و سوانح

مہاجرین حبشہ (۳۵)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۸

نقطۂ نظر

ہندو مت اور تصور نبوت؟ (۱)	مشفق سلطان	۴۸

اصلاح و دعوت

عدت اور چند مسائل	کوکب شہزاد	۵۵
قرآن اور ہمارے درمیان حائل رکاوٹیں	ڈاکٹر عدیل احمد	۶۱

یسئلون

اسلام کا مخاطب	شاہد رضا	۶۷
دین اور رسم و رواج	"	۶۹

شخصیات

حیات امین احسن (۱۳)	محمد بلال	۷۲

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد | محمد رفیع مفتی
طالب محسن | محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن | ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم | آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر | خورشید احمد ندیم
اظہار احمد | کوکب شہزاد
جنید حسن | مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

جاوید احمد غامدی

دین فطرت

اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو اُس کے جن خصائص کے ساتھ پیدا کیا ہے، وہی اُس کی فطرت ہے۔ انسان کی خلقت میں اِن خصائص کا ظہور اُس کے جبلی داعیات، جذبات و احساسات اور اُس کے اضطراری علم کی صورت میں ہوتا ہے۔ اِن کے لیے جو چیز سب سے بڑے محرک کا کردار ادا کرتی ہے، وہ انسان کے اندر ظاہر و باطن میں حسن و قبح کا شعور ہے۔ یہ جیسے ہی بیدار ہو جاتا ہے، اشیا اور افعال، دونوں پر اپنا حکم لگانا شروع کر دیتا ہے۔ انسان کے خالق نے یہ حکم اُس کی پیدایش کے ساتھ ہی اُس کے اندر الہام کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ بھی اُسی علم کا حصہ ہے، جسے ہم نے اوپر اضطراری علم سے تعبیر کیا ہے۔ نطق و بیان کی صلاحیت اِس کے بعد اِس کے لیے الفاظ کا پیرہن تیار کرتی ہے۔ یہ الہام خود انسان سے متعلق جن چیزوں پر حکم لگاتا ہے، وہ اصلاً تین ہی ہیں:

ایک، بدن کا حسن، جس کا لازمی نتیجہ طہارت اور نجاست کے مابین فرق کا شعور ہے۔

دوسرے، خور و نوش کی چیزوں کا حسن، جس کا لازمی نتیجہ اُن کے طیبات و خبائث کے مابین فرق کا شعور ہے۔

تیسرے، نیت، ارادے اور اعمال کا حسن، جس کا لازمی نتیجہ معروف اور منکر کے مابین فرق کا شعور ہے۔

انسان وارفتۂ حسن ہے، اور اِن سب چیزوں کا حسن جہاں اپنے منتہاے کمال پر ظاہر ہو گا، وہ فردوس بریں ہے۔ چنانچہ انسان کا نصب العین بھی وہی ہے، اور اُس کے لیے وہ محبت کے غیر معمولی جذبات اور اُس کو پا لینے کی شدید خواہش کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اُس کی تمام جدوجہد کا مقصود بھی ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اِس کو کسی نہ کسی درجے میں اپنے لیے فردوس بنا لینے میں کامیاب ہو جائے۔ وہ اِسی مقصد سے جیتا،

اِسی کے لیے مرتا، اِسی کے لیے رہنماؤں کے بت تراشتا، اُن کی پرستش کرتا، اُن کے دکھائے ہوئے خوابوں کو حقیقت بنا دینے کے لیے جان و مال کی قربانی پیش کرتا اور آنے والے زمانوں میں کبھی اساطیر اور کبھی علم کے تراشیدہ مسیحاؤں کا منتظر رہتا ہے۔ پھر یہی نہیں، اِس سے آگے وہ اپنی اِس جد و جہد کے حق میں فلسفے بھی ایجاد کر ڈالتا ہے۔

اللہ کے نبی انسان کو دنیا پرستی کے اِسی رویے پر متنبہ کر دینے اور اِس کے پیدا کیے ہوئے حجابات کو اٹھا کر حسن فردوس کا جلوہ اُس کو کسی حد تک اُس کی اِسی زندگی میں دکھا دینے کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں۔ دین حق اِسی حسن کا سراپا اور اِس کے منتہاے کمال پر اِس کو پا لینے کی دعوت ہے۔ چنانچہ فردوس میں داخل ہونے سے پہلے اُس کے ماحول سے ہم آہنگ ہو جانے کے لیے وہ اپنی اِس دعوت میں جن چیزوں کو اختیار کر لینے کی ہدایت کرتا ہے، وہ بھی اصلاً تین ہی ہیں:

ایک، تطہیر بدن۔

دوسرے، تطہیر خور و نوش۔

اور تیسرے، خلق اور خالق، دونوں کے ساتھ انسان کے تعلقات و روابط کی تطہیر۔ اِسے ہم مختصر طریقے پر تطہیر اخلاق سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ارشاد فرمایا ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ، وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائدہ ۵:۶)

”اللہ تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ تمھیں پاکیزہ بنائے، اور چاہتا ہے کہ اپنی نعمت تم پر تمام کرے تاکہ تم اُس کے شکر گزار ہو۔“

اِسی طرح فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ، يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ

”(اپنی رحمت میں اُن لوگوں کے حق میں لکھ رکھوں گا) جو اِس نبی امی رسول کی پیروی کریں گے، جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ اُنھیں بھلائی کا حکم دیتا ہے، برائی سے

وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ، وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِيۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ. (الاعراف ۷: ۱۵۷)

روکتا ہے، اُن کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام ٹھیراتا ہے اور اُن کے اوپر سے اُن کے وہ بوجھ اُتارتا اور بندشیں دور کرتا ہے۔ جو اب تک اُن پر رہی ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے جو قانون و حکمت دین حق کی حیثیت سے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے نازل کیا ہے، وہ اِنھی تین چیزوں کی تفصیلات اور اِن کے لوازم و مقتضیات کا بیان ہے۔ اِس کو ہم دین فطرت اِسی لحاظ سے کہتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے، فرمایا ہے:

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا، فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِيۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا، لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ، وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ. (الروم ۳۰: ۳۰)

’’سو ایک خدا کے ہو کر تم اپنا رخ اب اُس کے دین کی طرف کیے رہو۔ تم اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کی پیروی کرو، (اے پیغمبر)، جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی اِس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔‘‘

طالب محسن

رسول اللہ کی سرگذشت

آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عرب کے ایک چھوٹے سے شہر میں، جس کا نام مکہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ آپ کا نام احمد رکھا گیا، لیکن بعد میں آپ اپنے دادا کے دیے ہوئے لقب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے معروف ہوئے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اس زمانے میں مکہ کا شہر اہل عرب کے لیے ایک مذہبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس زمانے کی عالمی طاقتوں کی اس علاقے سے دل چسپی نہ ہونے کے برابر تھی، اس لیے کہ یہ علاقہ قدرتی وسائل کے اعتبار سے بھی کوئی کشش نہیں رکھتا تھا اور نہ حجاز اور اس کے قرب وجوار میں کوئی بڑی تہذیب پروان چڑھی تھی کہ دنیا اس کی طرف راغب ہوتی۔ عرب قبائل کی اکثریت صحرائی علاقوں میں آباد تھی اور کچھ قبائل کا پیشہ ہی لوٹ مار تھا۔ اس ماحول کی وجہ سے عرب ایک الگ دنیا تھی۔ مزید یہ کہ عرب ایک جزیرہ نما ہے۔ اس کے تین اطراف میں سمندر رہے۔ چنانچہ وہ ایک الگ تھلک علاقہ بن جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہ صرف عرب ہی تھے جو ایک طرف ایران اور دوسری طرف روم کی سلطنت میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے تھے۔ اسی طرح وہ سمندری راستوں سے بھی تجارت کرتے تھے۔ اس کے باعث برصغیر سے لے کر براعظم افریقہ تک ربط کا ایک ذریعہ تھے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز کیا تو قبل از اسلام کا زمانہ 'زمانۂ جاہلیت' کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسلام سے پہلے عرب بالکل کوئی حیوانوں کا ریوڑ تھے۔

اس سے مراد یہ تھی کہ عرب خالص حق سے محروم تھے۔ عرب بطور خاص مکہ کے باشندے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی پیدا کی ہوئی روایت کے حامل تھے۔ البتہ اس میں انھوں نے غلط عقائد اور بدعات شامل کر کے اس کی اصل ہیئت تبدیل کر دی تھی۔ اس گم راہی نے انھیں العلم سے دور کر دیا تھا۔ اس طرح حق سے محرومی، یعنی 'جاہلیت' ان کا ذہن و قلب اور تہذیب و ثقافت بن گئی تھی۔

العلم اور الحق سے دوری اور شرک و بدعات کی گم راہی نے انھیں راہ مستقیم سے ہٹا دیا تھا۔ اخلاق و کردار کے اعتبار سے بھی ان کے اندر بہت سی پستیاں تھیں۔ اس کے باوجود عرب قوم کچھ اچھی اقدار اور کچھ مثبت روایات کی حامل بھی تھی۔ عرب کے سخت حالات کی وجہ سے عربوں میں سختیوں کا سامنا کرنے کی اچھی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ بہادری، جنگ جوئی، استقامت اور جہد مسلسل ان کے کردار کا حصہ تھی۔ قبائلی نظام کے باعث حمیت، حمایت اور اپنوں کے لیے جاں نثاری ان کا روز مرہ تھا۔ ان کی اعلیٰ اخلاق کی قدر شناسی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انھوں نے آپ کے اعلیٰ کردار کے باعث صادق اور امین کا لقب دے رکھا تھا۔ جب ان خوبیوں کے ساتھ اسلام کی حقانیت ان کے علم و عمل کی رہنما بنی تو عرب ایک معمولی قوم سے اٹھی اور دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہو گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چالیس سال کے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں منصب نبوت سے سرفراز فرمایا۔ ان کو حق کا علم بردار بنا دیا۔ ان کو یہ ذمہ داری دے دی کہ جو حق عطا کیا گیا ہے، اس کا ابلاغ پوری شان کے ساتھ اپنی قوم کو کر دیں۔ آپ اپنی سمجھ داری، تجربہ کاری اور اپنے اعلیٰ کردار کی وجہ سے معاشرے کے ایک معزز فرد تھے۔ اگرچہ مکے کی اجتماعی ہیئت میں آپ کے قبیلے بنی ہاشم کو بھی ایک ذمہ داری حاصل تھی، لیکن سیاسی اثر و رسوخ کے اعتبار سے آپ کا قبیلہ بڑی حیثیت کا حامل نہیں تھا۔

آپ کے کار نبوت نے مکہ کی بستی کو حق کے رد و قبول کے جدال میں مبتلا کر دیا۔ آپ نے شہر مکہ کے بنیادی عقیدے شرک کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کے حق میں موجود استدلال کو بودا ثابت کر دیا اور اس کے لیے بہت دل آویز اسلوب میں بہت مؤثر دلائل پیش کر دیے۔ معاشرے میں رائج بدعات اور حلت و حرمت میں دین ابراہیم سے انحرافات کی نشان دہی کی اور ان کا ناحق ہونا واضح کیا۔ اسی طرح آپ نے معاشرے میں موجود اخلاقی برائیوں کو چھوڑنے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اپنانے کی دعوت دی۔ جو آپ کے ساتھ وابستہ ہوا، وہ اس کا نمونہ نظر آتا تھا۔ آپ جہاں خود اخلاق و کردار کی معجز نما شخصیت رکھتے تھے، وہاں آپ پر جو کلام اترا، وہ شکوہ ارشاد، حسن بیان، دل آویز غنا اور سکوت طاری کر دینے والے استدلال کا مرقع تھا۔ ان سب عوامل نے اہل مکہ کے

قصرِ فکر و عمل کی فصیلیں لرزہ براندام کر دیں۔

جب آپ کی دعوت عین حق تھی، اس کے نتائج بھی انتہائی شان دار تھے، جس بستی میں آپ یہ کام کر رہے تھے اس کو دو پیغمبروں ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے آباد کیا تھا، اس بستی میں بسنے والے انھی کی اولاد تھے، پھر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ یہ لوگ آگے بڑھ کر آپ پر ایمان لاتے اور دل و جان سے پیرو کار بن جاتے، لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اس بستی کے بڑے حصے نے اس دعوت کی مخالفت کی۔ اصل میں دو ہزار سال کے لمبے سفر نے انھیں فی الواقع مشرک بنا دیا تھا۔ اللہ کے ساتھ شرکا موجود ہیں، یہ عقیدہ ان کے لیے 'حق' کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، اس لیے ان کی طرف سے جو مزاحمت ہوئی، وہ بہت شدید تھی۔ جس طرح ہر سماج کی مذہبی اور سیاسی قیادت اس سماج کے عقائد و رسوم اور تہذیب و ثقافت کی محافظ بنی ہوتی ہے اور اپنی سیادت کے تسلسل اور اپنے ذاتی اقتدار کے لیے حسب ضرورت اس کو بطور ہتھیار استعمال کرتی ہے، یہی معاملہ مکہ کی مذہبی اور سیاسی قیادت کا تھا۔ اس نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے خلاف اپنے آبا کے مذہب کی حفاظت کا نعرہ بلند کیا۔ جس طرح آج ہم دیکھتے ہیں کہ اختلافی بات کو استدلال کی میزان میں تولنے کے بجاے اس کا مقابلہ مختلف اندیشوں کے نعرے لگا کر، شخصیت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر کے اور تشدد و اذیت رسانی کے طریقے اختیار کر کے کیا جاتا ہے، یہی طریق کار عربوں نے اختیار کیا۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لیے بہت ہی مشکل حالات پیدا ہو گئے۔

ہر طرح کا تشدد روا رکھا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور منصب نبوت کو مشکوک بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ گھڑے گئے۔ استہزا اور استخفاف کے لیے ہر پستی میں اترے۔ غرض یہ کہ مکہ کی قیادت نے حق کی طرف متوجہ ہونے والوں کی راہ مسدود کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ اس کے باوجود حق شناسوں نے اپنی حق شناسی کی ذمہ داری پوری کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائے اور آپ کی تعلیمات کو بھی اپنی زندگی بنا لیا۔ حالات کی سنگینی کے باعث آپ کے بہت سے اصحاب کو عرب سے باہر ایک مسیحی ملک حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔

مکہ کا شاید ہی کوئی گھر ہو جس کا کوئی فرد مسلمان نہ ہوا ہو۔ گویا مکہ کی بستی اچھی طرح بِلو لی گئی ہے۔ مکھن چھاچھ سے جدا ہو گیا ہے۔ ہر فرد کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ دعوت کیا ہے، اس کا استدلال کیا ہے، اس پر کیا اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور ان کے کیا جواب دیے گئے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ یہ دعوت جس رفتار سے مکہ اور مکہ سے باہر موجود حق پرستوں کو سمیٹتی چلی جا رہی ہے، اس سے قرآن کا یہ اعلان حقیقت بن

جائے گا کہ اس دعوت کے منکرین کا انجام مغلوبیت اور رسوائی ہے۔ چنانچہ اہل مکہ نے انتہائی رویہ اختیار کر لیا اور انتہائی اقدامات اٹھانے کے فیصلے کر لیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کار دعوت کے لیے ایک مستقر کی ضرورت تھی، یعنی کوئی عرب علاقہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو قبول کرے اور قریش کے آلام سے حفاظت کی ذمہ داری بھی اٹھائے۔ اسی مقصد سے آپ نے طائف کا سفر بھی کیا تھا۔ حج کے موقع پر بھی آپ نے اس غرض سے ملاقاتیں کیں۔ مدینہ کے دو بڑے قبائل اوس و خزرج سے ملاقات بہت نتیجہ خیز ہوئی۔ ان قبائل کی سیادت نے اسلام قبول کر لیا۔ اور ان کی کوششوں سے سال ڈیڑھ سال ہی میں مدینے میں اتنی تعداد میں لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے کہ یثرب کی بستی رسول اور ان کے ساتھیوں کی میزبانی کے قابل ہو گئی۔ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ گیر کی حیثیت سے نہیں، ایک مقتدا اور پیشوا کی حیثیت سے آنا تھا۔

اہل مکہ نے حق کی مخالفت کی۔ لوگوں کو حق سے دور رکھنے کا جرم کیا۔ اہل ایمان کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، یہاں تک کہ وہ اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ یہ وہ جرائم ہیں جنھیں اللہ کی زمین پر اللہ ہی کے مبعوث کیے ہوئے پیغامبر کی مخالفت میں کیا گیا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکومت اس دنیا پر قائم ہے۔ یہ حکومت عادل اور حکیم شہنشاہ کی حکومت ہے۔ جس کے ساتھ کوئی مجبوری یا کم زوری لاحق نہیں ہے۔ اس کا اختیار بھی لامحدود اور بے عیب ہے اور اس کا علم بھی لامتناہی اور بے خطا ہے۔ وہ حق اور اہل حق کے ساتھ ہے۔ یہاں دنیا میں اس کے فیصلے پردۂ غیب کے اندر سے آتے ہیں، اس لیے ان کے بارے میں انسانوں کا فہم بسا اوقات اس کی اصل کو نہیں پا سکتا۔ لیکن اللہ کے پیمبر جب دنیا میں ہوتے ہیں تو اہل حق کے ساتھ اللہ کی معیت اور اہل باطل کے خلاف اللہ کے اقدامات بالکل مشہود ہو جاتے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اور توجیہ ممکن نہیں رہتی۔ جیسا کہ قوم ثمود کے پیمبر نے اپنے کار دعوت کے اختتام پر ایک ناقہ نام زد کر دی۔ اگر منکرین اس کو نقصان پہنچائیں گے تو خدا کا عذاب نازل ہو جائے گا۔ جب انھوں نے اس ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ کا عذاب نازل ہو گیا۔ جو لوگ اس عذاب میں مبتلا ہوئے، ان کے لیے خدا کی عدالت ایک مشہود تجربہ تھی۔ جو اصحاب پیمبر اس سے محفوظ رہے، ان کے لیے بھی ان کا ایمان ایک حسی تجربے سے مؤکد ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں جب اہل کفر نے آخری اقدام کا فیصلہ کیا اور اسے نافذ کرنے کے درپے ہوئے تو اللہ نے ہجرت کا حکم دے دیا۔ اصحاب رسول کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ شہر نبی بننے والی بستی یثرب میں ہجرت کر جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس رات اپنے گھر سے نکلے اور مکہ چھوڑ گئے جب

اہل مکہ نے آپ کو قتل کرنے کے لیے چند نوجوان مقرر کیے اور وہ آپ کے گھر کے ارد گرد گھات لگائے ہوئے تھے۔ اس طرح یثرب کو یہ اعزاز حاصل ہو گیا کہ وہ اللہ کے رسول کی اٹھائی ہوئی دعوت کا مرکز بنے۔ اس بستی کو یہ مقام حاصل ہوا کہ اس کی سربراہی کسی قبائلی سردار کے بجائے سرور عالم کریں۔ اس بستی کی قسمت چمکی اور وہ یثرب جیسے منفی نام کے بجائے مدینۃ النبی جیسے مقدس نام سے موسوم ہو گئی۔

لیکن اہل مکہ اپنی حق دشمنی سے باز نہیں آئے۔ انھوں نے مدینہ پر جنگیں مسلط کیں، مگر یہی جنگیں ان پر خدا کا کوڑا بن کر برسیں اور ان کی طاقت عرب کی سرزمین میں شکست وریخت کا شکار ہوئی اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عرب کے سربراہ بن گئے۔ آپ کا دین تمام عرب کا دین بن گیا۔ مکہ جو شرک کا گڑھ بنا ہوا تھا، توحید کا مرکز بن گیا۔ عرب جو دنیا کی قوموں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، اقوام عالم کے قائد بن گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سارے واقعے پر اظہار تشکر کے لیے فتح مکہ کے موقع پر کیا جامع بات کہی:

لا إله إلا الله وحده لا شريك له صدق وعده ونصر عبده وهزم الأحزاب وحده. (السیرۃ، ابن حبان ۱/۳۱۵)

”اللہ یکتا ہی کارساز و کار فرما ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دیا۔ اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور صرف اسی نے تمام لشکروں کو ہزیمت دی۔“

یہ داستان اللہ کے نبی کی داستان ہے۔ یہ تاریخ کے صفحات پر روشن لفظوں میں درج ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اللہ کے سچے نبی تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو اعلانات آپ نے کیے تھے، وہ پادشاہ ارض و سما کی طرف سے آئے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو دعوت آپ نے اٹھائی تھی، وہ رحمٰن ورحیم کے حکم سے اٹھی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ عادل برحق ہے، اسی لیے اس نے حق کے مخالفین کی نقمت و فضیحت کو اور اہل حق کے غلبہ و رفعت کو یہاں مشہود بنا دیا تاکہ تمام انسان یہ یقین رکھیں کہ اس جہان فانی کی کہانی ایک جہان باقی پر منتج ہو گی۔ اہل خیر لازوال نعمتوں سے نوازے جائیں گے اور اہل شر خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی اس بات پر مہر تصدیق ہے کہ اسلام ہی بارگاہ ایزدی سے جاری کیا گیا دین برحق ہے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الزمر

(۴)

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ
وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾

اِن سے کہو کہ میرے بندو، جنھوں نے (میرے شریک ٹھیرا کر) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔[۶۳] اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ تم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اُس کے فرماں بردار بن جاؤ، اِس سے پہلے کہ تم پر اُس کا عذاب آجائے۔[۶۴] پھر تمھاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ۵۳-۵۴

۶۳۔ یعنی اُس سے مایوس ہو کر دوسروں کے سہارے نہ پکڑو۔ غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کرو گے تو وہ بڑے سے بڑے گناہ کو بھی بخش دے گا۔

۶۴۔ یہ اُسی عذاب کا ذکر ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے۔

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ
الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا
فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ
هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ
كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا
وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾

تم اُس بہترین چیز[۶۵] کی پیروی کرو جو تم پر تمھارے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے، اِس سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تمھیں اُس کی خبر بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو[۶۶] کہ (بعد میں) کوئی کہے کہ ہاے افسوس، میری اُس کوتاہی پر جو مجھ سے خدا کے معاملے میں صادر ہوئی، اور حقیقت یہ ہے کہ میں تو مذاق ہی اڑاتا رہا۔ یا یہ کہے کہ اگر اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی اُس سے ڈرنے والوں میں ہوتا۔ یا عذاب کو دیکھے تو کہے کہ کاش، مجھے دنیا میں پھر جانا ہو کہ میں بھی خوبی سے عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں! کیوں نہیں، (میں نے تو ہدایت بخشی تھی، چنانچہ) میری آیتیں تمھارے پاس آئی تھیں، پر تم نے اُنھیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور منکروں میں شامل رہے۔ ۵۵-۵۹

۶۵۔ یعنی قرآن مجید کی، جو تحریف کے تمام شوائب سے پاک خدا کی آخری کتاب ہے اور نہایت منفرد اور دل نشیں اسلوب اور فصیح و بلیغ عربی زبان میں دین فطرت کے حقائق کو اتنے مختلف پہلوؤں سے واضح کرتی ہے کہ کوئی بلید سے بلید آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی جگہ کوئی ابہام باقی رہ گیا ہے۔

۶۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى'۔ اِن میں 'اَنْ' سے پہلے مضاف عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ
جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٦٠﴾ وَيُنَجِّى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا
يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿٦٢﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٣﴾

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ
وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ

(لوگو)، قیامت کے دن تم دیکھو گے کہ اُن کے چہرے سیاہ ہیں، جنھوں نے (خدا کے شریک ٹھیرا کر) خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ اِن تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا کیا جہنم میں نہ ہو گا؟[67] (اُس دن) اللہ اُن لوگوں کو اُن کے مامن میں[68] نجات عطا فرمائے گا جو اُس سے ڈرتے رہے۔ اُن کو نہ وہاں کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ زمین اور آسمانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔ (اُس کے خزانوں سے کوئی دوسرا کسی کو کچھ نہیں دے سکتا، اِس لیے) جنھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کر دیا ہے، وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ ۶۰-۶۳

اِن سے کہو، نادانو، (یہ واضح حقائق ہیں)، کیا پھر بھی تم مجھے اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کے لیے کہتے ہو؟ دراں حالیکہ تمھاری طرف بھی، (اے پیغمبر)، یہ وحی بھیجی جا چکی ہے اور اُن کی طرف بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں کہ اگر تم شرک کرو گے تو تمھارا عمل اکارت ہو کر رہ جائے

۶۷۔ یعنی جہنم ہی میں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ ایسے سرکش اگر جہنم کے سزاوار نہیں ہوں گے تو اور کون ہو گا؟

۶۸۔ یعنی جنت میں، جہاں اُن کے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے۔

الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٦﴾
وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ
مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى
فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ

گا[۶۹] اور تم ضرور خسارے میں پڑو گے۔ اِس لیے ہرگز شرک نہ کرو، بلکہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور اُسی کے شکرگزار بندوں میں رہو۔[۷۰] ۶۴-۶۶

اِن لوگوں نے خدا کی قدر نہیں کی، جیسا کہ اُس کی قدر کرنے کا حق تھا (اور اُس کے شریک ٹھیرا دیے، ورنہ اُس کی عظمت کا عالم تو یہ ہے کہ) قیامت کے دن پوری زمین (گویا) اُس کی مٹھی میں ہو گی اور آسمان اُس کے دہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔ (اُس دن ساری خدائی کا حال یہ ہو گا کہ) صور میں پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ چاہے۔[۷۱] پھر اُس میں دوبارہ پھونکا جائے گا تو دفعتاً وہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے[۷۲] اور

۶۹۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کے ساتھ کسی عمل کو بھی قبول نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے اُن بندوں کی نیکیاں قبول کرتا ہے جو تنہا اُسی کو پوجتے ہیں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتے۔

۷۰۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے بعد بندہ اپنے پروردگار کا شکرگزار نہیں رہتا، بلکہ اُس کی بندگی میں دوسروں کو شریک کر کے بالکل ناشکرا بن جاتا ہے۔

۷۱۔ یہ غالباً اُن ملائکہ کی طرف اشارہ ہے جو عرش الٰہی کے ارد گرد خدا کی حمد و تسبیح میں مصروف ہوں گے۔ سورہ کے آخر میں اُن کا ذکر ہے۔

وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿٦٩﴾
وَوُفِّيَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿٧٠﴾
وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡهَا فُتِحَتۡ

زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی[73] اور اعمال کی کتاب رکھ دی جائے گی اور گواہی کے لیے پیغمبر حاضر کیے جائیں گے اور وہ بھی جو گواہی کے منصب پر فائز کیے گئے[74] اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا، اُن پر کوئی ظلم نہ ہو گا اور ہر شخص کو، جو کچھ اُس نے کیا تھا، اُس کا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔[75] اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔[76] ۶۷-۷۰
(اِس کے بعد توحید کی دعوت کا) انکار کرنے والے گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے،

۷۲۔ اوپر جو مضمون بیان ہوا ہے، یہ اُسی کی مزید توسیع ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... مطلب یہ ہے کہ جس دن کی ہول ناکی کا یہ عالم ہے، اُس دن کس کی مجال ہے کہ خدا کے آگے ناز و تدلل کے ساتھ بڑھ کر کسی کی وکالت یا سفارش کر سکے اور جس خدا کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اُس کے ایک نفخۂ صور سے ساری خدائی بے ہوش اور پھر ساری خدائی بیدار ہو گی، کون ہے جو اُس کا ہم سر بننے کا مدعی ہو سکے!" (تدبر قرآن ۶/۶۱۱)

۷۳۔ یعنی وہ زمین جو نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ قیامت کے دن وجود میں آئے گی اور ہمارے آفتاب کے بجائے اللہ کے نور سے روشن ہو گی جس سے محسوسات و مرئیات سے آگے تمام حقائق و معانی بھی روشنی میں آجائیں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ اِس کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

۷۴۔ یعنی ذریت ابراہیم کے لوگ جو زمین پر نبیوں کی دعوت کے گواہ بنائے گئے۔ اُن کی نمایندگی، ظاہر ہے کہ اُن کے مجددین و مصلحین کریں گے۔ سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۷۸ اور آل عمران (۳) کی آیت ۳۳ میں قرآن نے ذریت ابراہیم کے اِس منصب کی تصریح فرمائی ہے۔

۷۵۔ یعنی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی اور ہر ایک اپنی ہی بوئی ہوئی فصل کاٹے گا۔

۷۶۔ یہ تمام تفصیل اِس لیے کی گئی ہے کہ مشرکین آنکھیں کھولیں کہ اصل حقیقت کیا ہے اور وہ کیا آرزوئیں لیے بیٹھے ہیں۔

اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ
اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ
حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾
وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ
اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

یہاں تک کہ جب اُس کے پاس پہنچیں گے تو اُس کے دروازے (اُن کے لیے) کھول دیے جائیں گے اور اُس کے داروغے اُن سے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس تمھی لوگوں میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمھارے پروردگار کی آیتیں تمھیں سناتے اور تمھارے اِس دن کی ملاقات سے تمھیں ڈراتے تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں، آئے تو سہی، مگر عذاب کی بات منکروں پر پوری ہو کے رہی۔[77] کہا جائے گا: جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اُس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ سو تکبر کرنے والوں کا[78] یہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۷۱-۷۲

اِس کے برخلاف جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اُس کے پاس پہنچیں گے اور اُس کے دروازے (اُن کے لیے) کھول دیے جائیں گے اور اُس کے پاسبان اُن سے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، خوش رہو اور اِس میں

۷۷۔ یہ انتہائی حسرت کا جملہ ہے کہ خدا نے منکرین حق کے لیے روز ازل جس فیصلے کا اعلان کر دیا تھا، افسوس ہے کہ وہ نافذ ہو کے رہا۔

۷۸۔ یہ اُنھی منکرین کی صفت ہے جن کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اِس سے انکار کے سبب پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ درحقیقت اُن کا تکبر ہی تھا جو انکار کا باعث بن گیا۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۷۴﴾

وَتَرَی الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِیَ

ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ، اور وہ اُن کے جواب میں کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو اِس زمین کا وارث بنا دیا، اب ہم جنت میں، جہاں چاہیں، ٹھیریں،[۷۹] تو یہ صلہ ہو گا اُن کا۔[۸۰] سو عمل کرنے والوں[۸۱] کا یہ کیا ہی اچھا صلہ ہے! ۷۳-۷۴

(اُس دن، جب زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو گی) اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش الٰہی کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کر رہے ہیں۔[۸۲] اُس

۷۹۔ یعنی پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ جہاں چاہیں، فروکش ہو جائیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے معلوم ہوا کہ وہاں کسی کی خواہشوں اور ارادوں میں مزاحم ہونے والی کوئی چیز نہیں ہو گی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جس کا اِس جہان میں کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی حقیقت اُسی وقت سمجھ میں آئے گی، جب وہ نیا جہان نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ اور انسان اپنی نئی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ظہور میں آئے گا اور یہ زمین سورج کے بجائے اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۶۱۵)

۸۰۔ یہ جواب شرط ہے جو اصل میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۸۱۔ اوپر اِسی جگہ ’مُتَكَبِّرِیْنَ‘ کا لفظ ہے۔ اُس کے مقابل میں یہاں بظاہر ’خَاشِعِیْنَ‘ یا ’مُتَّقِیْنَ‘ کا محل تھا، مگر قرآن نے اِن کی جگہ ’عٰمِلِیْنَ‘ کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ کرنا چاہا ہے کہ جنت کے حصول کے لیے اصلی چیز عمل ہے۔ چنانچہ استاذ امام کے الفاظ میں، جو لوگ سفارشوں کے بل پر جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں، وہ جنت الحمقا میں بس رہے ہیں۔

۸۲۔ آیت ۶۷ سے آگے بڑھتے ہوئے یہاں تک آیئے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ’وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا‘ سے متصل ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس میں جن فرشتوں کا ذکر ہے، وہ حاملین عرش اور اُن کے زمرے کے فرشتے ہیں۔ ’حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ‘ کے

بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾

دن لوگوں کے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور (ہر طرف سے) صدا بلند ہو گی کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے، جہانوں کا پروردگار![۸۳] ۷۵

الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

۸۳۔ یعنی اہل ایمان بھی یہی کہیں گے اور حاملین عرش بھی اُن کے ہم نوا ہوں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’اِس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو جو چیز سزاوار حمد و شکر بناتی ہے، وہ اُس کا عدل اور نیک و بد کے درمیان اُس کا فرق و امتیاز ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے اور ایک اندھیر نگری کے خالق کو کوئی حمد و شکر کا سزاوار نہیں مان سکتا۔ قیامت کے دن جب اُس کے کامل عدل اور اُس کی کامل رحمت کا ظہور ہو گا، تب ہر ایک کا تردد دور ہو جائے گا اور ہر گوشے سے اُس کی حمد کا ترانہ بلند ہو گا۔ گویا جس صبح حمد کے لوگ انتظار میں تھے، وہ طلوع ہو گئی اور یہ جہان خدا کے نور سے جگمگا اٹھا۔‘‘ (تدبر قرآن ۶/۶۱۶)

معارف نبوی

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز

بعثت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اور آپ کا زمانۂ رسالت

— ۱ —

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (قال):[۱] أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُنْزِلَ عَلَيْهِ وَهُوَ ابْنُ أَرْبَعِينَ سَنَةً، فَأَقَامَ بِمَكَّةَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ سَنَةً، [ثُمَّ أُمِرَ بِالهِجْرَةِ فَهَاجَرَ إِلَى المَدِينَةِ، فَمَكَثَ بِهَا عَشْرَ سِنِينَ][۲]، فَتُوُفِّيَ وَهُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَسِتِّينَ.

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں نزول وحی کی ابتدا ہوئی۔ آپ (اپنی رسالت کے) تیرہ سال مکہ میں رہے، پھر آپ

کو ہجرت کا حکم ہوا تو آپ نے مدینہ کا رخ کیا اور وہاں دس سال رہے اور پھر تریسٹھ سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔[1]

۱۔ بعض روایتوں میں یہ مدت ۶۵ اور بعض میں ۶۰ سال بھی بیان ہوئی ہے۔اِسی طرح مدینہ میں قیام کی مدت کے بارے میں بھی کچھ اختلافات ہیں۔اِس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں دیہات میں بھی، خاص کر پیدایش کی تاریخ سے متعلق اِس طرح کے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، اِس لیے کہ یہ سب زیادہ تر زبانی روایات کے ذریعے سے منتقل ہوتا ہے، جن میں سہو و نسیان کے امکانات ہر وقت باقی رہتے ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔اس روایت کا متن اصلاً مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۳۸۸۸ سے لیا گیا ہے۔اس کے راوی ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔اس کے متابعات اِن کتابوں میں منقول ہیں:

مسند طیالسی، رقم ۲۸۷۴۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۶۵۴۴۔ مسند احمد، رقم ۲۱۱۰، ۲۲۴۲، ۳۴۲۹، ۳۵۰۳۔ صحیح بخاری، رقم ۳۸۵۱، ۳۹۰۳۔ صحیح مسلم، رقم ۲۳۵۲-۲۳۵۳۔ سنن ترمذی، رقم ۳۶۲۱، ۳۶۵۲۔ شرح مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۱۹۴۰، ۱۹۴۱، ۱۹۴۶۔ المعجم الاوسط، طبرانی رقم ۸۱۹۴۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۰۷۰۷، ۱۱۲۰۵، ۱۲۹۴۴۔ حلیۃ الاولیاء، اصبہانی ۳/ ۳۵۱۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۲۱۶۸، ۱۲۱۶۹۔ شمائل محمدیہ، ترمذی، رقم ۳۷۹۔ دلائل النبوہ، بیہقی ۲/ ۱۳۱۔

الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ یہ روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔اِس کے یہ شواہد ان مراجع میں دیکھے جا سکتے ہیں:

الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۱/ ۱۴۹۔ تاریخ طبری، رقم ۳۹۷-۴۰۰۔

۲۔ صحیح بخاری، رقم ۳۸۵۱۔

المصادر والمراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (۱٤۲۷هـ/۲۰۰٦ م). **العلل**. ط ۱. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض:

مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (١٢٧١هـ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط ١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن أبي شيبة عبد الله بن محمد. (١٤٠٩هـ). **الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار** .ط ١. تحقيق: كمال يوسف الحوت. الرياض: مكتبة الرشد.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠هـ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حبان محمد بن حبان البُستي. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان**. ط ٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط ١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د. عاصم بن عبدالله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط ١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن سعد محمد بن سعد. (١٤٠٨هـ). **الطبقات الكبرى**. ط ٢. تحقيق: زياد محمد منصور. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

ابن شبة زيد بن عبيدة. (١٣٩٩هـ). **تاريخ المدينة**. تحقيق: فهيم محمد شلتوت. بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن عدي عبدالله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط ١.

تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠ھ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبدالقيوم عبد رب النبي. مكة مكرمة: المكتبة الامدادية.

ابن المِبرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣ھ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط ١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩ھ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط ١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

أبو اسحٰق الحويني. (١٤٣٣ھ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط ١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو الحسين محمد بن أحمد الغساني الصيداوي. (١٤٠٥ھ). **معجم الشيوخ**.ط١. تحقيق: د. عمر عبد السلام تدمري. بيرو، طرابلس: مؤسسة الرسالة، دار الإيمان.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو زرعة عبدالرحمٰن بن عمرو الدمشقي. (١٤١٧ھ/١٩٩٦ء). **تاريخ أبي زرعة**. ط١. رواية: أبي الميمون بن راشد. دراسة وتحقيق: شكر الله نعمة الله القوجاني. بيروت: دارالكتب العلمية.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني. (١٤١٩ھ/١٩٩٨م). **معرفة الصحابة**. ط١. تحقيق: عادل بن يوسف العزازي. الرياض: دار الوطن للنشر.

أبو نعيم أحمد بن عبد الله الأصبهاني. (١٣٩٤ھ/١٩٧٤م). **حلية الأولياء وطبقات الأصفياء**. د.ط. بيروت: دار الكتاب العربي.

أبو يعلى أحمد بن علي الموصلي. (١٤٠٤ھ/١٩٨٤م). **مسند أبي يعلى**. ط ١. تحقيق: حسين سليم أسد. دمشق: دار المأمون للتراث.

الآجُرِّيُّ محمد بن الحسين. (١٤٢٠ھ/١٩٩٩م). **الشريعة**. ط ٢. تحقيق: الدكتور عبد الله بن عمر بن

سليمان الدميجي. الرياض: دار الوطن.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢ھ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨ھ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢١ھ/٢٠٠١م). **المسند**. ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط، وعادل مرشد، وآخرون. بيروت: مؤسسة الرسالة.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت. دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧ھ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط ١. حلب. القاهرة. دار الوعي مكتبة دار التراث.

البخاري محمد بن إسمٰعيل. (١٤٢٢ھ). **الجامع الصحيح**. ط١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البخاري ابو عبدالله محمد بن ابراهيم. (١٣٩٧ھ/١٩٧٧ء). **التاريخ الصغير**. ط١. تحقيق: محمود إبراهيم زايد. حلب، القاهرة: دار الوعي، مكتبة دار التراث.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٢٤ھ/٢٠٠٣م) .**السنن الكبرى** .ط ٣. تحقيق: عبد المعطي أمين قلعجي. بيروت: دار الكتب العلمية.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٠٨ھ/١٩٨٨م). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١. تحقيق: وثق أصوله وخرج أحاديثه وعلق عليه: الدكتور عبد المعطى قلعجى. القاهرة: دار الريان للتراث. بيروت: دار الكتب العلمية.

الترمذي محمد بن عيسى. (١٣٩٥ھ/١٩٧٥م). **سنن الترمذي**. ط ٢. تحقيق وتعليق: أحمد محمد شاكر (ج١، ٢) ومحمد فؤاد عبد الباقي (ج٣) وإبراهيم عطوة عوض المدرس في الأزهر الشريف (ج٤، ٥). مصر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي.

الترمذي أبو عيسى محمد بن عيسى. (١٤١٣ھ/١٩٩٣م). **الشمائل المحمدية والخصائل المصطفوية**. ط١. المحقق: سيد بن عباس الجليمي. مكة المكرمة: المكتبة التجارية، مصطفى أحمد الباز.

الحاكم محمد بن عبد الله المعروف بابن البيع. (١٤١١ھ/١٩٩٠م). **المستدرك على الصحيحين**. ط١. تحقيق: مصطفى عبد القادر عطا. بيروت: دار الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠ھ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥ھ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط ١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض. دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣ھ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧ھ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الانصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط ١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة. دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحي شفيق حسن. بيروت. دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧ھ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت. عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

الطبراني سليمان بن أحمد. (د.ت). **المعجم الأوسط**. د.ط. تحقيق: طارق بن عوض الله، عبد المحسن بن إبراهيم. القاهرة: دار الحرمين.

الطبراني سليمان بن أحمد. (١٤١٥ھ/١٩٩٤م). **المعجم الكبير**. ط ١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي. القاهرة: مكتبة ابن تيمية.

الطبري محمد بن جرير. (١٣٨٧ھ/١٩٦٧م). **تاريخ الطبري**. ط ٢. تحقيق: محمد أبو الفضل إبراهيم. بيروت: دار التراث.

الطحاوي أحمد بن محمد. (١٤١٥ھ/١٩٩٤م). **شرح مشكل الآثار**. ط ١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

الطيالسي سليمان بن داود. (١٤١٩هـ/١٩٩٩م) .**مسند أبي داود الطيالسي** .ط ١. تحقيق: الدكتور محمد بن عبد المحسن التركي. مصر: دار هجر.

عبد الرزاق أبو بكر بن همام. (١٤٠٣هـ). **المصنف**. ط ٢. تحقيق: حبيب الرحمٰن الأعظمي. الهند: المجلس العلمي.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط ١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة. مكتبة الدار.

الكَشّي أبو محمد عبد الحميد. (١٤٠٨هـ/١٩٨٨م). **المنتخب من مسند عبد بن حميد**. ط ١. تحقيق: صبحي البدري السامرائي، محمود محمد خليل الصعيدي. القاهرة: مكتبة السنة.

مسلم بن الحجاج النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د.ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١ م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط ١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

النسائي أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرى**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

مقالات

ساجد حمید

’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟

(۷)

لب لباب[۳۴]

ہم نے سورۂ قیامہ ۷۵ کی آیات: ’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ. ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ‘ کے معنی یہ متعین کیے ہیں:

قرآن کے لیے زبان کو حرکت نہ دو کہ اس کو جلدی پاؤ، یہ ہمارا کام ہے کہ قرآن کی جمع وتالیف اور اس کی

۳۴۔ میرے اس مضمون کی ماہیت کچھ ایسے تھی کہ میں قاری کو اپنے ساتھ ہم سفر بنا کر چل رہا تھا، جس میں نقطۂ نظر اور استدلال بتدریج ارتقا اور نفی واثبات کے تقابل سے گزر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ یکجا بسیط (sheer) انداز سے بیان نہیں ہوا تھا۔ مدیر ’’اشراق‘‘ جناب طالب محسن صاحب نے تجویز فرمایا ہے کہ مضمون میں بکھرے ہوئے، اس نقطۂ نظر کو مختصر طور پر بھی بیان کر دیا جائے۔ لب لباب کی سرخی کے تحت یہ سطور اسی تقاضے کو پورا کرنے کی سعی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اس سے مقصد پورا ہو جائے۔ اس طرف توجہ دلانے پر میں طالب صاحب کا شکر گزار ہوں۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہاں میں صرف سورۂ قیامہ کی چار آیات ۱۶ تا ۱۹ کے حوالے سے بات کر رہا ہوں، روایات کا جو میں نے تجزیہ کیا ہے، ان کا خلاصہ خوف طوالت سے پیش نہیں کر رہا ہوں۔ اسی طرح استدلال بھی پورا یہاں بیان نہیں ہو سکے گا۔ ان کے لیے قاری کو پورا مضمون پڑھنے کی زحمت اٹھانا ہی ہو گی۔

قراءت کریں۔ لہٰذا، جب ہم قراءت کر دیں تو بس اس کی اسی قراءت کی پیروی کرو۔ پھر یہ بھی ہمارا کام ہے کہ قرآن کو بیان کریں۔(۱۶-۱۹)[مقصود: یہ سب آپ کے نہیں، ہمارے دائرۂ اختیار کے کام ہیں، اس لیے آپ ان کے لیے زبان کو زحمت نہ دیجیے، یہ سب ہم اپنی صواب دید پر کریں گے۔]

یعنی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ قیامہ کے نزول کے وقت یہ مطالبہ کیا کہ قرآن جلد از جلد بیان ہوا کرے تو آپ کو یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ قرآن مجید کے اتارنے کا فیصلہ ہمارا ہو گا، آپ کے مطالبات پر نہیں اترے گا۔ مطلب یہ کہ بیان قرآن ہمارے فیصلہ کے مطابق ہو گا کہ کب کیا اترنا ہے اور کیا نہیں۔ اس کے ساتھ مزید دو باتوں کے بارے میں بھی آپ کو حفظ ماتقدم کے طور پر آگاہ کیا گیا کہ قرآن سے متعلق یہ بھی آپ کے کام نہیں ہیں۔ ان میں سب اختیار اللہ ہی کا ہے: ایک قرآن کی جمع و تالیف اور دوسرے متن کی قراءت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم پر نہیں چھوڑی گئی یا آپ کے دائرۂ کار میں شامل نہیں ہے، یعنی جمع قرآن کے بارے میں تسلی سے زیادہ الٰہی اختیار کا بیان ہے کہ قرآن سے متعلق یہ تینوں کام اللہ کے دائرۂ عمل سے متعلق ہیں۔

میں نے ان آیات کی تفسیر میں اصلاً چار جگہ پر مختلف بات کہی ہے۔ ایک 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ'، دوسرے 'اِنَّ عَلَيْنَا' اور تیسرے 'ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا' اور چوتھے 'بَيَانَهٗ' کے بارے میں۔ باقی آیات یا ان کے اجزا سے متعلق پہلے بھی مفسرین یہی تفسیر کر چکے ہیں۔ مثلاً 'جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ' کو بالترتیب جمع و تدوین اور قراءت کے معنی میں لینا وغیرہ۔

معروف تفسیر میں مفسرین نے 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ' کو تازہ اترے ہوئے متن قرآن کو بہ عجلت پڑھنے کے معنی میں لیا ہے۔ اس معروف رائے کے تحت کلام کی تراکیب یوں ہو سکتی ہیں:

۱۔ 'لَا تُحَرِّكْ بِالْقُرْاٰنِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بحفظه': قرآن جلدی یاد کرنے کے لیے زبان کو قراءت کے لیے حرکت نہ دیجیے۔

یہ جملہ تو بامعنی ہے، اور نحواً ممکن بھی ہے، مگر یہ قرآن کی دیگر نصوص اور تصریحات کے خلاف ہے، اس لیے کہ حفظ قرآن کے لیے آپ کو جلدی جلدی قرآن پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی، قرآن براہ راست آپ کے دل ہی پر اتر رہا تھا (البقرہ ۲: ۹۷)۔ اس سے پہلے اترنے والی سورۂ اعلیٰ میں یہ وعدہ ہو چکا ہے کہ قرآن نہ آپ کو بھولے گا نہ ضائع ہو گا، اس لیے اس فکر کی ضرورت نہیں تھی کہ قرآن طاق نسیاں میں چلا جائے گا۔ اس رائے سے اگلی آیات کا مضمون بھی مطابقت نہیں رکھتا، یعنی 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' اور آیات ۱۷ اور ۱۸۔ اسی طرح اس رائے کے لیے 'جَمْعَهٗ' کو اس کے معنی سے ہٹانا پڑا۔

سورۂ قیامہ پہلی سورت نہیں تھی۔ اگر پہلی سورتوں میں یہ معمول تھا، تو پھر روکنے کے لیے الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ اگر پہلی دفعہ آپ نے دوران وحی یاد کرنا شروع کیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ اگر یاد کرنا پڑتا ہی تھا، تو یہ سورہ بھی بعد میں یاد کر لیتے جیسے پہلی سورتیں آپ آج تک یاد کرتے رہے تھے۔ اسی طرح ''زبان کو حرکت نہ دیجیے'' اس بات کے کہنے کے لیے غیر مناسب الفاظ ہیں، کیونکہ یہ الفاظ ''پڑھنے'' کو روکنے سے زیادہ ''منہ کھولنے / بات کرنے سے منع کرنے'' کے معنی ادا کرتے ہیں۔ اگر وحی کے اترنے کا طریقہ یہ چلا آ رہا تھا کہ جبریل سناتے، آپ دہراتے تو پھر بھی منع کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ اس صورت میں کہنا چاہیے تھا کہ آج سے آپ ایسا نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ حرکت زبان سے منع کر رہے ہیں، تو واضح ہوا کہ یہ نزول وحی کے نظام کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف آپ کی طرف سے کوئی اقدام ہوا تھا۔ نظام وحی کی کوئی mechanism ضرورت ہوتی تو روکا نہ جاتا۔ جس سے آپ سے لازم آتا ہے کہ یہ پہلا اور آخری حرکت لسانی کا عمل تھا۔

۲۔ 'لَا تُحَرِّكْ بِالْقُرآنِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِأخذِهِ'۔ (یعنی وحی کی شدت سے نکلنے کو) جلدی اخذ کرنے کے لیے زبان کو قراءت کے لیے حرکت نہ دیجیے۔

یہ بھی جملہ تو بن گیا ہے، مگر اوپر پہلے نکتہ کے لیے بیان کردہ تمام اعتراضات اس پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ وحی کی تکلیف قرآن کی تصریحات کے خلاف ہے، حضرت موسیٰ، حضرت مریم، حضرت زکریا اور خود نبی کریم کی پہلی وحی کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے، کہیں کسی کی تکلیف کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ سورۂ نجم (۵۳) میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بیان کہ 'مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى' (۱۷) اور 'مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى. اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى' (۱۱-۱۲) وغیرہ کسی ادنیٰ سی تکلیف کی بھی گنجایش نہیں چھوڑتے۔ پھر یہ کہ تکلیف کی وجہ سے جلدی کرنے کے لیے یہ جواب مناسب نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ جواب ہونا چاہیے تھا کہ یہ چند برس کا معاملہ ہے، وحی کا سلسلہ ختم ہوتے ہی یہ تکلیف جاتی رہے گی۔ اسی طرح ہر آیت کی قراءت کرنے لگ جانا وحی کی تکلیف سے نکلنے کے لیے موزوں نہیں، کیونکہ اس سے تو مزید دیر ہو گی، جب کہ یہ نزول وحی کے نظام کی ضرورت نہیں تھی۔

۳۔ 'لَا تُحَرِّكْ بِالْقُرآنِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بجبريل': جبریل سے آگے نکلنے (ان سے منازعت: کشاکش) کے لیے زبان کو قراءت کے لیے حرکت نہ دیجیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نفیس، صابر اور متحمل طبیعت سے بعید ہے کہ آپ جبریل سے منازعت کرتے ہوں۔ اوپر بیان کردہ باقی اعتراضات بھی اس پر وارد ہوتے ہیں۔ عقلاً یہ تصور کرنا بھی محال ہے کہ یہ منازعت

ہوتی کیسے ہو گی، یعنی منازعت کے لیے زبان ہلانے کی کیا صورت ہو گی۔ مثلاً یہ کہ ابھی جبریل نے آدھی آیت پڑھی ہوتی تو آپ جلدی سے اسے پورا کرنے لگتے؟ یا مثلاً آپ کہنے لگتے: اگلی آیت بتائیے! اگلی آیت بتائیے! (استغفر اللہ)۔

میرے نقطۂ نظر کے لحاظ سے قرآن کے ایک طالب علم کو یہ تردد ہو سکتا ہے کہ اگر 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ' سے متن قرآن کو پڑھنا مراد نہیں تو پھر اس جملے میں 'بِهٖ' کا کیا مطلب ہے؟ میں نے اسے اسی معنی میں لیا ہے، جس معنی میں سب لے رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سب لوگ 'بِهٖ' کے جار مجرور کے مابین 'قرآن' یا 'قراءۃ' کا مصدر حذف مان رہے ہیں، یعنی 'لَا تُحَرِّكْ بِقراءتِهِ لِسَانَكَ'۔ میں نے یہ محذوف 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' کی رعایت سے طلب یا مطالبہ کا لیا ہے، یعنی 'لَا تُحَرِّكْ بِمطالبتهِ لِسَانَكَ'، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس محذوف کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا، لیکن سمجھانے کے لیے یہ کہہ رہا ہوں۔ اس لیے میں نے اوپر یہ ترجمہ کیا ہے: ''قرآن کے لیے زبان کو حرکت نہ دو کہ اسے جلدی پاؤ''۔ اس محذوف کو اگر کھول دیں تو ترجمہ یوں ہو گا: ''مطالبۂ قرآن کے لیے زبان کو حرکت نہ دو کہ اسے جلدی پاؤ''۔ اردو محاورے میں ترجمہ کریں تو یوں ہو گا: ''قرآن جلدی پانے کے لیے اس کی طلب میں زبان کو حرکت نہ دو''۔ یعنی حرکت لسانی قرآن کے حصول کی عجلت کے لیے ہے، اس لیے حصول کے موافق کوئی مصدر مقدر ماننا ہو گا، اور وہ طلب یا مطالبہ ہی ہو سکتا ہے، تیز تیز پڑھنا نہیں۔

'لِتَعْجَلَ بِهٖ' کے بارے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے، ''جلدی طلب'' کے معنی مسلم ہیں۔ مفسرین نے 'بِهٖ' کے جار مجرور کے مابین 'حفظ' یا 'أخذ' کو حذف مانا ہے، یعنی 'لِتَعْجَلَ بِأخذهِ/ بحفظه'۔ میں نے اسے بس 'استعجال'، یعنی ''وقت سے پہلے طلب کرنا'' کہ چیز حین وقوع (due time) سے پہلے حاصل ہو جائے، کے معنی میں لیا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی 'استعجال' کے معنی میں لیا ہے: 'كان جبريل عليه السلام ينزل بالقرآن، فيحرِّك به لسانه، يستعجل به، فقال: لا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ' (بحوالہ طبری)۔ حین وقوع سے پہلے طلب کی ایک مثال دیکھیے: ابو صخر الہذلی کا شعر ہے:

قَدْ كَانَ صَرْمٌ فِى الْمَمَاتِ لَنَا　　فَعَجِلْتِ قَبْلَ الْمَوْتِ بِالصَّرْمِ

''ہماری جدائی موت پر ہونا ہی تھی، پر تم نے موت سے پہلے ہی جدائی اپنا لی۔''[۳۵]

۳۵۔ اس شعر کی ترکیب سورۂ طٰہٰ (۲۰: ۱۱۴) کے اس جملے کو سمجھنے میں معاون ہو سکتی ہے: 'وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ

اس مثال سے واضح ہے کہ یہ صرف جھٹ پٹ کام کرنے کے معنی میں نہیں آتا۔ لہٰذا جب ہم نے 'لِتَعْجَلَ بِهٖ' کے معنی ''قرآن کی جلد طلب'' کے سمجھے ہیں کہ حسب موقع قرآن جلد بیان ہو جائے، تو آپ سے آپ 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ' کے معنی تقاضا کرنے یا مطالبہ وحصول کے لیے حرکت ہی کے ہوں گے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ پانی جلدی پانے کے لیے زبان کو حرکت نہ دو۔ تو واضح ہے کہ زبان کی حرکت پانی مانگنے کے لیے ہو رہی ہے۔

'اِنَّ عَلَيْنَا' کے معنی کیا ہیں؟ یہ دوسرا مقام ہے، جہاں ہم نے عمومی تفسیر سے مختلف راے دی ہے۔ ہماری راے دو پہلوؤں سے مختلف ہے:

ایک یہ کہ چونکہ 'اِنَّ عَلَيْنَا' والے جملے 'لَا تُحَرِّكْ' کی نہی کا سبب بتا رہے ہیں[36] کہ اللہ تعالیٰ نے حرکت لسانی سے کیوں منع کیا، یعنی آپ کو بولنے سے کیوں روکا گیا؟ اس لیے لازم ہے کہ آیت ۱۶ میں جس چیز پر بولنے سے روکا گیا ہے، اگلی تینوں چیزوں: 'جَمْعَهٗ'، 'قُرْاٰنَهٗ' اور 'بَيَانَهٗ' میں سے کم از کم ایک ایسی ہو گی جس کے لیے زبان کو حرکت دی گئی تھی، وگرنہ نہی اور اس کی تعلیل میں رشتۂ تعلیل قائم نہیں ہوگا۔ ان تین میں سے ہم نے حرکت زبان کا سبب جس چیز کو قرار دیا ہے، وہ آگے چل کر واضح ہو گا۔

دوسرے یہ کہ 'اِنَّ عَلَيْنَا' یہاں 'اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى' (اللیل ۹۲: ۱۲) کے معنی میں نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ محض اپنی ذمہ داری بتا رہے ہیں، بلکہ یہ 'فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ' (الرعد ۱۳: ۴۰) میں 'وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ' کے معنی میں آیا ہے، یعنی ابلاغ آپ کا کام ہے اور حساب ہمارا۔ مراد یہ کہ حساب آپ کے دائرے کی چیز نہیں ہے۔ اس آیت میں بھی بس یہی مطلب ہے کہ آپ اس پر زبان کو زحمت نہ دیں، یہ ہمارا کام ہے، آپ کا نہیں۔

یہ ہم کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس لیے کہ 'لَا تُحَرِّكْ' کے بعد 'اِنَّ عَلَيْنَا' کا تقابل یہی معنی دے گا، خواہ کوئی

مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ'۔ علامہ مرزوقی اس شعر کے معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: 'فقال یعتب علیها: قد كان لنا في الموت قطيعة وافتراق، لكنك لم تصبري إلى حين وقوعه، ولم تنتظري نزوله، فتعجلت الصرم قبل الموت'۔ شاعر اموی دور کا ہے۔

۳۶۔ تقریباً تمام مفسرین کے ہاں 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ' نہی اور ''اِنَّ عَلَيْنَا' سے لے کر آیت ۱۹ کے اختتام تک نہی کی تعلیل ہے۔

بھی تفسیر کر لیں۔ مثلاً جلد جلد یاد کرنے کے لیے زبان کو زحمت نہ دیجیے، یاد کرانا ہمارے ذمے ہے۔ تو مطلب یہی ہوا کہ یاد کرنے کا اہتمام آپ کا نہیں، ہمارا کام ہے، اس لیے آپ یاد نہ کریں۔ میں اس معنی پر صرف ایک پہلو (shade) کا اضافہ کر رہا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ یہاں دائرۂ عمل یا دائرۂ اختیار کی بات ہو رہی ہے۔ اس کے لیے ایک قرینہ 'لَا تُحَرِّكْ' اور 'اِنَّ عَلَيْنَا' کا تقابل ہے، جیسے محولہ بالا سورۂ رعد کی آیت ۴۰ میں ہے، اور دوسرا قرینہ 'فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ' کے الفاظ ہیں، یعنی یہ جملہ یہ بتا رہا ہے کہ قرآن کے متن کی قراءت کا تعین آپ کے فہم پر نہیں چھوڑا گیا ہے، آپ کو محض پیروی کرنا ہے۔ سو واضح ہوا کہ یہاں جو امور زیر بحث ہیں، وہ نبی کریم کی صواب دید پر نہیں چھوڑے گئے۔ اگر روایات کے اثر سے نکل کر دیکھا جائے تو 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ' کے الفاظ کا چناؤ، یعنی ''زبان نہ ہلائیے'' اور پھر اس کے ساتھ 'بِهٖ' کا جار مجرور کہ ''اس پر'' یا ''اس کے لیے زبان نہ ہلائیے''، بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

'قُرْاٰنَهٗ' کو بھی ہم نے اس کے معروف معنی میں لیا ہے، یعنی پڑھنا۔ لیکن عہد حاضر میں بعض لوگوں نے اس سے سبع قراءات میں جو قراءت کے معنی ہیں، اس معنی میں اسے نہیں لیا۔ ہم نے واضح کیا ہے کہ پڑھنا قراءت ہی ہے۔ خاص طور پر عربی زبان، جس میں نحو اعراب پر منحصر ہو، اور الفاظ کے املا میں حروف علت حذف کر دیے جاتے ہوں، وہاں قراءت، یعنی محض پڑھ دینے کا مطلب لفظ کا تلفظ و حرکات اور اعراب بول دینے سے الفاظ کا نحوی محل بیان ہوتا ہے۔ لہٰذا، جب کوئی عبارت پڑھے گا تو یہ سب متعین ہوتا چلا جائے گا۔ اس لیے یہ آیت حتمی حجت ہے کہ اس وعدۂ قراءت کی تکمیل کے بعد ایک ہی قراءت ہے، جس کی پیروی کی جائے گی۔ یہ وعدہ ہر سال کے عرضات اور عرضۂ اخیرہ کے ذریعے سے پورا کیا گیا تھا۔

'جَمْعَهٗ' کے بارے میں بھی ایک نکتہ یہاں بیان کرنا ضروری ہے۔ 'قُرْاٰنَهٗ' کے الفاظ کے زیر اثر ہم نے 'جَمْعَهٗ' کے معنی کا تعین بھی کیا ہے۔ معروف تفسیر میں اسے دل میں جمع کرنے یا یاد کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ 'قُرْاٰنَهٗ' کے سیاق میں ہونے کی وجہ سے اس کو صرف دل میں حفظ اور جمع کرنے کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا، اس لیے کہ دل میں حفظ ہونا قراءت کو شامل ہوتا ہے، یعنی جب ہمیں کوئی چیز یاد ہو گی تو اعراب و حرکات اور تلفظ کے ساتھ یاد ہو گی۔ اس لیے دل میں ''جمع کرانے'' کے بعد قراءت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا لازم ہے کہ 'جَمْعَهٗ' کو تحریری صورت میں مانا جائے، کیونکہ تحریر ہی میں عربی جیسی زبان میں قراءت کی ضرورت ہوتی ہے[۳۷]۔

۳۷۔ مجھے اس آیت میں اس اہتمام کے ساتھ قراءت کے ذکر کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ متن قرآن میں عہد نبوی ہی

’ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا‘ کے معنی بھی وہی ہیں، جو ’اِنَّ عَلَيۡنَا‘ کے بارے میں ہم نے عرض کیے ہیں۔ صرف ’ثُمَّ‘ کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ اپنے عطف کے اعتبار سے تشریک فی الحکم کے لیے آیا ہے، یعنی ’بَيَانَهٗ‘ کو بھی ’جَمۡعَهٗ‘ اور ’قُرۡاٰنَهٗ‘ کی طرح اللہ نے اپنے دائرۂ اختیار میں شامل کرنے کے لیے ’ثُمَّ‘ سے عطف کیا ہے۔ جس سے ’ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا‘ قرینہ بن گیا ہے اس بات کا کہ آپ نے حرکت لسانی سے جو مطالبہ کیا تھا، وہ ’بَيَانَهٗ‘ (بیان قرآن) تھا یا اس سے متعلق کوئی چیز۔ یہ پورا جملہ ’ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ‘ یہاں ’لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ‘ کے جواب میں ہونے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالبہ کی نشان دہی کر رہا ہے۔ میں نے اس جملے کے اس پہلو کو سمجھانے کے لیے ایک تمثیل پیش کی تھی۔ اس میں خط کشیدہ جملے ’لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ‘ اور ’ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا‘ کے ہم محل ہے:

> ”کوئی بیٹا اپنی شادی کی جلدی کے لیے ماں سے کہے کہ آپ کل فلاں کے گھر جائیے، اور میرے لیے رشتہ دیکھیے۔ ماں آگے سے جواب دے کہ یہ بات نہ کرو، یہ ہمارا کام ہے کہ ہم سب اسباب مہیا کریں، تمھاری شادی کرائیں، تو جب ہم شادی کرا دیں تو تم اسے نبھاؤ گے، اگر ماں یہاں رک جائے تو تب بھی بچے کو پورا جواب ہو گیا ہے، لیکن بیٹے کے مطالبہ والی بات کو شامل کرتے ہوئے وہ یہ کہے کہ پھر یہ بھی ہمارا کام ہے کہ کہیں رشتہ دیکھنے جائیں۔“ (اشراق، مئی ۲۰۲۴ء، ص:۳۹)

اس تمثیل سے ایک یہ واضح کرنا پیش نظر ہے کہ آپ کا مطالبہ ’بَيَانَهٗ‘ سے متعلق تھا، اس لیے اس کے ساتھ ’ثُمَّ‘ لگایا گیا ہے، جیسے اس تمثیل میں ”پھر یہ بھی ہمارا کام ہے“ میں ”پھر“ استعمال کیا گیا ہے، وگرنہ آیت میں اس ’ثُمَّ‘ کا محل سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ اگر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالبہ کے جواب میں نہیں آیا تو یہ ’ثُمَّ‘ یہاں ’بَيَانَهٗ‘ کے اس زائد از پروگرام ہونے کے معنی دے گا جو خدا کے پیش نظر نہیں تھا، مگر آپ کے مطالبہ کی وجہ سے ضرورت سامنے آنے پر قرآن سے متعلق پروگرام میں شامل کیا گیا۔ یا یہ آپ کے مطالبہ کی تردید کے معنی دے گا کہ آپ کا مطالبہ ایسا تھا کہ جس میں قرآن کا بیان طلب کیا گیا تھا۔ جیسے مذکورہ تمثیل میں رشتہ دیکھنے کا مطالبہ لڑکے کا تھا، جسے ”پھر یہ بھی ہمارا کام ہے“ کے الفاظ سے رد کیا گیا ہے۔ اسی تمثیل کے تناظر میں سورۂ قیامہ کی آیات پر بھی غور کریں تو بات صاف ہو جائے گی۔ یہاں میں نے ’بَيَانَهٗ‘ سے متعلق آیت سولہ میں یہ پہلو بریکٹس میں کھول دیا ہے تاکہ میرا مدعا پانے میں آسانی ہو:

میں اعراب لگانے کی کوئی صورت اختیار کی گئی ہو گی، لیکن کسی دعویٰ سے بیش تر لازم ہے کہ تحقیق سے ثابت کیا جائے۔ اس کے لیے اس زمانے کے مخطوطات کی تلاش کرنا ہو گی۔

”قرآن کے لیے زبان کو حرکت نہ دو کہ یہ چاہتے ہوئے کہ قرآن جلدی [بیان کیا جائے] (۱۶)، یہ ہمارا کام ہے کہ قرآن کی جمع وتالیف اور اس کی قراءت کریں (۱۷)۔ لہٰذا جب ہم قراءت کر دیں تو بس اس کی اسی قراءت کی پیروی کرو۔ (۱۸) پھر یہ بھی ہمارا کام ہے کہ قرآن کو بیان کریں (۱۹)“

دوسرے اس تمثیل سے یہ واضح کرنا پیش نظر ہے کہ 'جَمْعَهٗ' اور 'قُرْاٰنَهٗ' کا بیان 'بَيَانَهٗ' پر مقدم کیوں ہوا ہے، اور ان کے ذکر کا موقع کیسے بنا ہے۔

'بَيَانَهٗ' کے معنی تیسرا مقام ہے، جہاں ہم نے معروف تفسیر سے اختلاف کیا ہے، اور یہ سب سے نازک مقام ہے۔ 'بَيَانَهٗ' کو ”شرح ووضاحت کرنے“ کے معنی میں لیا گیا ہے۔ ہم قدیم عربی میں اس کے استعمالات کے مطالعہ کی بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'بیان' ”واضح کہنے“ کے معنی میں تو آتا ہے، لیکن ”کسی قول، عبارت، کلام یا آیت کی شرح کرنے“ کے معنی میں نہیں۔ یہ بالکل مولد معنی ہیں، جو بعد میں پیدا ہوئے[38]۔ بیان کے

۳۸۔ یہ معنی دراصل سنت اور قرآن کے باہمی تعلق کی بحثوں سے پیدا ہوئے، جن میں آیت 'وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ' (النحل ۱۶: ۴۴) کا لفظ 'تُبَيِّنَ' مشق ستم بنا۔ اب اس کے لیے کچھ آیات کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً 'قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ' (البقرہ ۲: ۶۸)۔ اس میں 'يُبَيِّنْ' کو غیر واضح کو واضح کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بنی اسرائیل نے صرف یہ کہا تھا کہ آپ گاے ذبح کرنے کا حکم دے رہے ہیں، تو اللہ سے کہیے کہ وہ بتائے کہ گاے کیسی ہو؟ یہ بالکل ویسا ہی جملہ ہے، جیسا آگے گاے کے رنگ سے متعلق ہے: 'يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا' (البقرہ ۲: ۶۹)، یعنی پیچھے گاے کا کوئی رنگ مذکور نہیں ہے کہ جس کی توضیح مانگی گئی ہو۔ تو یہاں ان دونوں مقامات پر 'يُبَيِّنْ' صرف ”بتانے“ کے معنی میں ہے، مجمل کی تفصیل یا مشکل کی شرح کے معنی میں نہیں۔ وہ تو سب پوچھ رہے تھے کہ گاے کیسی ہو؟ جوابات سے بھی یہی واضح ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کے حکم یا گاے کی توضیح کے جملے نہیں تھے، جو بات پوچھی گئی، اس کے جواب میں ایک ایسی نئی بات بتائی گئی ہے جو نہ پہلے لفظوں میں تھی نہ ان کے مضمرات میں۔ ویسے بھی جب حضرت موسیٰ نے ان سے کہا کہ گاے ذبح کریں تو یہ مجمل یا مبہم حکم نہیں تھا۔ یہود نے شرارت کی وجہ سے گاے سے متعلق یہ سوالات کیے تھے۔ انھوں نے ”خدا کی پسند“ پوچھی تھی، گاے یا گاے کے ذبح کے حکم کی شرح نہیں۔ کلام عرب میں ایک بھی مثال ہمیں نہیں ملی جو کلام کی شرح کے معنی پر دلیل ہو۔ تمام اشعار خفا سے اظہار یا ابہام سے پاک ہونے کے معنی دیتے ہیں۔ ضمرۃ بن ضمرہ نے نعمان بن منذر کے سامنے اپنے مرد حر ہونے پر بات کرتے ہوئے کہا تھا: 'وإن نطق نطق ببيان'، وہ جب بولتا ہے تو کھل کر صاف اور مستند بات کہتا ہے، یعنی وہ ڈھکے چھپے پیرائے میں بات نہیں کرتا، خواہ بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو۔

قدیم عربی میں معنی 'بلاغ' کے ہیں، یعنی بتانے، کہہ دینے، آگاہ کرنے، واشگاف کہنے، انکشاف کرنے، خبر دینے، ثبوت دینے اور فیصلہ کن بات کہنے کے۔ وضاحت کرنے کے معنی میں جب یہ آتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو بات کہی جا رہی ہو، وہ ابہام یا خفا سے پاک ہو، معنی شعر در بطن شاعر والی صورت نہ ہو، واضح ہو[39] یعنی کلام بلیغ اور فصیح ہو، بات کھلی اور صاف ہو، مدعا پر صحیح صحیح دلالت کر رہی ہو، فیصلہ کن ہو۔ بات واضح کرنے اور شرح کرنے میں واضح، مگر نازک فرق گڈمڈ نہیں ہونا چاہیے۔ غرض 'بیان' اس وضاحت کے معنی میں نہیں آتا جسے ہم تفسیر، تشریح یا اجمال کی تفصیل کہتے ہیں۔ سورۂ قیامہ میں بھی یہ کہنے، بیان کرنے اور خبر دینے کے معنی میں ہے، شرح آیات کے معنی میں نہیں۔ یہاں اس کا مفعول بہ صرف قرآن ہے، یعنی قرآن کو بیان کرنا بھی اللہ کا کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ قرآن کب اور کتنا اتارنا ہے، آیات کی صورت میں کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے، کتنا کہنا ہے اور کس کو کہنا ہے، کس موقع پر کہنا ہے، اور کن الفاظ میں کہنا ہے، یہ سب اللہ کا کام ہے، آپ کے مطالبات کا اس میں دخل نہیں ہے، اس لیے اس کو جلدی طلب کرنے کا مطالبہ نہ کریں۔ اسی بات کو یہاں 'لَا تُحَرِّكْ ... ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہاں کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ 'بَيَانَهٗ' کے جو معنی تم لے رہے ہو: ''قرآن کو بیان کرنا''، یعنی موقع بہ موقع اتارنا تو اس کے لیے کیا نزول اور وحی وغیرہ کے الفاظ زیادہ موزوں نہیں تھے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ یہ دونوں الفاظ وہ بات نہیں کہہ سکتے جو 'بَيَانَهٗ' کہہ رہا ہے، یعنی: 'ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا نزولَهٗ / وحيَه' کہا جاتا تو مطلب ہوتا: ''پھر نزول قرآن یا وحی بھی اللہ کا کام ہے''۔ ان الفاظ سے تو مدعا ہی بدل جاتا ہے۔ جو بات

۳۹۔ امرؤ القیس کو جب اس کے باپ کے قتل کی اطلاع ملی، وہ حضرموت میں صیلع پہاڑ کی چوٹی پر دوستوں کے ساتھ تھا، یہ اطلاع اسے کیسے ملی اور اس نے اس خبر کو کیسے بیان کرنے کا کہا، وہ دیکھیے:

أتاني وأصحابي على رأس صيلع حديث أطال النوم عني فأنعما
فقلت لعِجلي بعيد مآبه أَبِنْ لي وبَيِّن لي الحديث المجمجما
فقال أبيت اللعن عمرو وكاهل أباحا حمى حجر فأصبح مسلما

ہماری دل چسپی دوسرے شعر سے ہے، باقی اشعار سیاق فراہم کرنے کے لیے لکھے ہیں، کہتا ہے ''میں نے عجلی سے کہا، جس کا پلٹنا بعید تھا، مجھے (خبر) بتاؤ، اور چھپی خبروں سے آگاہ کرو۔ پہلا 'ابن'، 'أبان' سے فعل امر ہے، صرف بتانے کے معنی میں آیا ہے، اور دوسرا تفعیل سے فعل امر ہے، جو 'مجمجما' کے مقابل میں ہے، وہ بھی ''آگاہ کرو'' کے معنی میں آیا ہے۔ یہ اگرچہ ثلاثی مجرد کی مثالیں نہیں ہیں، لیکن ان سے اس لفظ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ضرور ملے گی۔

میں نے اوپر عرض کی ہے، وہ ان الفاظ سے ادا نہیں ہوتی۔ ''قرآن کو بیان کرنے'' کے مدعا کے لیے 'بیان' سے بہتر کوئی لفظ نہیں تھا۔

بیان قرآن کی جلد ضرورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شدت سے محسوس ہوتی تھی، اس لیے کہ آپ انذار قرآن کے ذریعے سے کرتے تھے (ق ۵۰: ۴۵)۔ دوسرے یہ کہ قرآن کی آیات قریش و اہل کتاب کے ساتھ چلتے ہوئے مباحث میں صحیح تر جواب دیتا، آپ اور مسلمانوں کی رہنمائی، ثبات قدم اور بشارت و تسلی کا سامان بنتا تھا (النحل ۱۶: ۱۰۲)۔ قرآن کی اس ضرورت کے پیش نظر آپ جبریل کا انتظار کرتے رہتے (مریم ۱۹: ۶۴)۔

قرآن کی شرح و وضاحت کے اس مزعومہ وعدہ —— جو 'ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ' سے سمجھا گیا ہے —— کے معہود کی کوئی مثال قرآن میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے کچھ مفسرین کو کہنا پڑا ''یہ وضاحت ہم آپ، یعنی نبی کریم کے ذریعے سے'' کریں گے، ان کے پیش نظر حدیث تھی، حالاں کہ کلام: 'اِنَّ عَلَيۡنَا' اس کو قبول نہیں کرتا، اور حدیث میں پورا قرآن تو در کنار ان آیات کی شرح بھی موجود نہیں ہے، جن کے فہم میں اختلاف ہوا ہے۔ زمخشری جیسے مفسر کو یہ کہنا پڑا کہ جہاں اشکال ہوگا، وہاں وضاحت کی جائے گی، ان کے پیش نظر اس طرح کی آیات تھیں: 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ'۔ حالاں کہ ان آیات کے تمام مقامات قرآن میں دیکھیے کہ ان میں سے ایک آیت بھی کسی آیت کی شرح نہیں ہے۔ محض بات کہہ دینے کے معنی میں ہے کہ یوں اللہ اپنی آیات تمھیں بیان کرتا ہے۔ مقصود ان آیات کا یہ ہے کہ اللہ اپنا حکم اپنے الفاظ میں بیان فرما رہے ہیں۔ 'يُبَيِّنُ' کے لفظ سے یہ بھی مقصود ہے کہ بتوں سے بات کرتے ہو تو وہ جواب نہیں دیتے، مگر اب عہد نبوی میں اللہ تمھیں جواب دے رہے ہیں (البقرہ ۲: ۱۸۶)۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مشکل آیت کی پورے قرآن میں کبھی تشریح نہیں کی ہے۔ اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی، اس لیے نہ یہ اللہ کا وعدہ تھا اور نہ اسے پورا کرنے کی ضرورت تھی۔

کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ سورۂ نساء کی ایک آیت کی توضیح میں ایک آیت اتری تھی؟ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہاں 'يُبَيِّنُ' کے بعد آیت کا لفظ ہی نہیں آیا: 'يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ ... يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمٌ' (۴: ۱۷۶)۔ یعنی یہ بھی کسی آیت کی تبیین (شرح) نہیں ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۱-۱۲ میں جو بات کہی گئی تھی، وہ اور تھی، مگر اس سے ایک اشارہ نکل رہا تھا کہ اولاد کی عدم موجودگی میں بہن بھائی حصہ دار ہوں گے۔ جن صحابہ نے اس اشارہ کو پالیا انھوں نے اس کی تصدیق کے لیے اللہ کی رائے طلب کی، اللہ نے اپنی رائے 'يُبَيِّنُ' (صراحت سے بیان) کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں 'يَسۡتَفۡتُوۡنَكَ'

(النساء ۴: ۱۷۶) کے الفاظ آئے ہیں، جس کے معنی ''طلب راے'' کے ہوتے ہیں، ''توضیح و تشریح'' کے نہیں۔ غرض قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس کی تشریح و توضیح قرآن میں کی گئی ہو کہ کسی آیت کے معنی میں نعوذ باللہ اشکال ہو، اور اس اشکال کا ازالہ کیا گیا ہو۔

مزید یہ کہ کتاب مبین کی شان کے خلاف ہے کہ اس کا کوئی جملہ ایسا ہو، جس کی شرح کرنی پڑے، بلکہ یہ کہنا کتاب مبین کے تصور ہی کی نفی ہے، اور اس کے اولین مخاطب پر کج فہمی کی تہمت۔

آیات کی اس توضیح کے بعد ہم نے دو روایتوں کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ تجزیہ اس لیے کیا ہے کہ ہمارے خیال میں ایک طرف دور اول میں سورۂ قیامہ کی آیات میں جمع قرآن، یعنی 'جَمْعَهٗ' کے معنی بدلنے کے لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نام ایک جھوٹی تفسیر منسوب کی گئی تاکہ جمع قرآن کے توقیفی[۴۰] ہونے کی نص مشتبہ المعنی ہو جائے، اور تفسیر ماثور کے تراشیدہ تقدس کی رو سے 'جَمْعَهٗ' کے معنی حفظ کے لے لیے جائیں۔ دوسری طرف جمع قرآن کی ایک کہانی تراشی گئی تاکہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تائید کریں اور اس باطل کو محکم کریں کہ قرآن اخبار آحاد ہی کی طرز پر صحابہ نے جمع کیا۔ سورۂ قیامہ میں جس 'جَمْعَهٗ' کا وعدہ تھا، وہ حافظۂ نبوی میں ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی چلا گیا۔ جنگ یمامہ کے بعد جو قرآن جمع ہوا تھا، اس میں خدا اور رسول کی کوئی مداخلت وراے شامل نہیں تھی۔

ہم نے درایتاً ان روایتوں کے علل و عیوب، ان کے باہمی اور تاریخی تناقضات، نصوص قرآن سے ٹکراؤ وغیرہ بیان کر کے واضح کیا ہے کہ یہ روایتیں تراشیدہ ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان کی سند پر بحث نہیں کی، صرف اتنی بات لکھی ہے کہ یہ تمام روایات گو کتب حدیث میں وارد ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی حدیث نبوی نہیں ہے۔

۴۰۔ علوم القرآن کی ایک اصطلاح، جس کے معنی ہیں: اللہ کی طرف سے ٹھیرایا ہوا یا مقرر کیا ہوا، یعنی قرآن کا جمع ہونا اور اس کی ترتیب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ توقیفی ہے۔

سیر و سوانح

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۳۵)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت عمرو بن ابو سرح رضی اللہ عنہ

نام و نسب کا الجھاؤ

حضرت عمرو بن ابو سرح کے دادا کا نام ربیعہ بن ہلال تھا۔ مالک (اہیب: ابو نعیم اصفہانی) بن ضبہ چوتھے اور حارث بن فہر چھٹے جد تھے۔ ساتویں جد فہر بن مالک کی نسبت سے وہ فہری اور قریش سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قرشی کہلاتے ہیں۔ ابو سعید (ابو سعد: ذہبی) کنیت اختیار کرتے تھے۔ واقدی، ابو معشر اور ابن سعد نے ان کا نام معمر، ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور ابو نعیم اصفہانی نے عمرو لکھا ہے۔ ابن عبد البر، ابن اثیر اور ابن حجر نے ان کے حالات زندگی عمرو اور معمر، دونوں ناموں کے تحت بیان کیے ہیں۔ ابن اثیر نے چوتھے جد کا نام عمرو کے ساتھ مالک اور معمر کے ساتھ اہیب لکھا ہے، ابن عبد البر نے دونوں جگہ اہیب، جب کہ ابن حجر نے دونوں صورتوں میں مالک ثبت کیا ہے۔

حضرت عمرو کی والدہ زینب بنت ربیعہ بنو عامر بن لؤی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ابن عبد البر اور ابن اثیر نے حضرت وہب بن ابو سرح کو حضرت عمرو کا بھائی قرار دیا ہے، جب کہ ابن حجر نے بھائی مانتے ہوئے نسب دوسرا

بیان کیا ہے۔ انھوں نے حضرت وہب بن سعد بن ابو سرح کو حضرت عمرو کا بھتیجا بتایا ہے، جب کہ ابن سعد، ابو نعیم اصفہانی، ابن عبد البر اور ابن اثیر نے انھیں دوسری شخصیت قرار دیا ہے۔

مصر کے گورنر عبد اللہ بن سعد بن ابو سرح کا حضرت عمرو بن ابو سرح سے کوئی رشتہ نہ تھا، وہ دوسرے قبیلے بنو عامر بن لؤی سے تعلق رکھتے تھے۔

قبول اسلام

حضرت عمرو بن ابو سرح آفتاب رسالت طلوع ہونے کے فوراً بعد نور ہدایت سے منور ہوئے۔

ہجرت حبشہ

حضرت عمرو بن ابو سرح نے حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں حصہ لیا۔ ''الاستیعاب'' اور ''اسد الغابہ'' کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرو کے بھائی حضرت وہب بن ابو سرح نے بھی حبشہ ہجرت کی، جو درست نہیں۔ بلاذری کہتے ہیں: ہیثم بن عدی نے حضرت وہب کا مہاجرین حبشہ میں ذکر کیا ہے، یہ بات ثابت نہیں۔

حبشہ سے واپسی

شوال ۵/ نبوی میں قریش کے قبول اسلام کی غلط خبر حبشہ میں موجود اصحاب تک پہنچی تو کچھ نے یہ کہہ کر مکہ کا رخ کیا کہ ہمارے کنبے ہی ہمیں زیادہ محبوب ہیں۔ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ جو خبر انھیں سنائی گئی، جھوٹ تھی تو ان میں سے کچھ حبشہ لوٹ گئے۔ البتہ تینتیس اصحاب اور چھ صحابیات نے مکہ میں قیام کرنے کو ترجیح دی۔ حضرت عمرو بن ابو سرح انھی میں شامل تھے، انھیں کسی مشرک کی پناہ نہ ملی۔ تینتیس صحابہ میں سے اٹھائیس نے اپنی ازواج کے ساتھ مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے، حضرت عمرو کا شمار انھی میں ہوتا ہے۔ چار صحابہ حضرت سلمہ بن ہشام، حضرت عیاش بن ابو ربیعہ، حضرت ہشام بن العاص اور حضرت عبد اللہ بن سہیل کو ان کے اہل قبیلہ نے قید کر لیا اور ایک صحابی حضرت سکران بن عمرو نے ہجرت مدینہ سے قبل مکہ میں وفات پائی۔

ہجرت ثانیہ اور مہاجرین کی واپسی

رجب ۵/ نبوی میں حضرت عثمان کی قیادت میں پندرہ (: ابن ہشام۔ سولہ: ابن سعد) صحابہ و صحابیات کے

حبشہ ہجرت کرنے کو ہجرت اولیٰ کا نام دیا جاتا ہے۔ شوال ۵ر نبوی میں حضرت جعفر بن ابوطالب کی سربراہی میں ایک سو ایک رکنی قافلہ سوے حبشہ روانہ ہوا۔ابن سعد کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق اس قافلے میں تراسی صحابہ،قریش سے تعلق رکھنے والی گیارہ اور دوسرے قبائل کی سات صحابیات شامل تھیں، قافلے میں موجود آٹھ بچوں کو بھی شمار کر لیا جائے تو ایک سو نو کا عدد حاصل ہوتا ہے۔اسے ہجرت ثانیہ کہا جاتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہ قریش کے مسلمان ہونے کی افواہ سن کر حبشہ میں مقیم کچھ مہاجرین کے خوشی خوشی اپنے کنبوں میں لوٹنے کے بعد ہوئی۔انھوں نے لوٹنے والے اصحاب کی تعداد نہیں بتائی،ابن ہشام نے البتہ تینتیس مردوں اور چھ عورتوں کا ذکر کیا ہے۔مکہ میں داخل ہونے کے بعد قریش کا تعذیب و اذیت رسانی کا سلسلہ زیادہ شدت کے ساتھ دوبارہ شروع ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باردگر حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ حضرت عثمان بن عفان نے کہا: ہماری ہجرت اولیٰ اور یہ ہجرت نجاشی کی جانب ہے اور آپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے۔آپ نے فرمایا: تم اللہ اور میری طرف ہجرت کر رہے ہو اور تمھیں ان دونوں ہجرتوں کا ثواب ملے گا (الطبقات الکبریٰ)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت اولیٰ میں کل سولہ صحابہ حبشہ گئے تو انتالیس افراد لوٹ کیسے آئے؟ پھر واپس آنے والے صحابہ میں کتنے ہی ہیں جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ہجرت ثانیہ میں حبشہ گئے۔اس کا مطلب ہے کہ ہجرت ثانیہ پہلے ہوئی اور مہاجرین کی واپسی بعد میں، حالاں کہ ہجرت ثانیہ مہاجرین کے مکہ داخل ہونے اور ظلم و تعدی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہونے کے بعد بتائی جاتی ہے۔ایک مضمون نگار کا جملہ اس عقدے کو کسی طور حل کرتا ہے: پہلے (سولہ رکنی) قافلہ کی روانگی کے بعد لوگ برابر ہجرت کرتے رہے۔اس طرح رجب اور شوال کے درمیان حبشہ جانے والوں اور مکہ لوٹ کر ہجرت ثانیہ میں شامل ہونے والوں کا شمار پورا ہو سکتا ہے۔ شبلی نعمانی اور اکبر شاہ نجیب آبادی کہتے ہیں: قریش کے مسلمان ہونے کی غلط خبر سن کر مہاجرین کے لوٹنے سے پہلے تراسی مسلمان حبشہ پہنچ چکے تھے، یہ وہی عدد ہے جو ہجرت ثانیہ کے بعد مرد اصحاب کا بتایا جاتا ہے۔ قاضی سلیمان منصور پوری ہجرت اولیٰ کا بیان کرنے کے بعد، افواہ اور مہاجرین کی واپسی کا ذکر کیے بغیر لکھتے ہیں: ان کے پیچھے اور بھی مسلمان (۸۳ مرد ۱۸ عورتیں) مکہ سے نکلے اور حبشہ کو روانہ ہوئے۔ ”تاریخ طبری“ اور ”السیرۃ النبویۃ“، ابن اسحٰق کی عبارتیں بھی یہی ہیں۔ابن ہشام نے حضرت عثمان کی قیادت میں جانے والے قافلے اور حضرت جعفر کے ساتھ اور ان کے بعد حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کا ذکر ایک ہی عنوان ’ذکر الھجرۃ الأولی

إلی أرض الحبشة‘ کے تحت بیان کیا ہے (السیرة النبویة)۔ کئی فصلوں کے بعد انھوں نے اہل مکہ کے اسلام کی خبر سن کر تینتیس صحابہ اور چھ صحابیات کی حبشہ سے واپسی کا ذکر کیا اور ہجرت ثانیہ کا نام نہیں لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ مہاجرین کا مکہ کی طرف رجوع، دونوں ہجرتوں کے بعد ہوا۔

یہ متعین کرنے کے بعد ایک ہی اشکال باقی رہتا ہے: ابن سعد نے صراحت کی ہے کہ ہجرت ثانیہ مہاجرین کے رجوع کے بعد ہوئی۔ چونکہ یہ بیان باقی کتب تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لیے درست بات یہی ہے کہ حضرت جعفر بن ابوطالب کا قافلہ ہجرت اولیٰ کے فوراً بعد حبشہ گیا، یہی ہجرت ثانیہ تھی۔ قریش کے مسلمان ہونے کی افواہ سن کر مہاجرین کی مکہ واپسی بعد میں ہوئی۔ اس کے بعد حضرت عثمان کی قیادت میں وہ اصحاب گئے جنھیں ابن سعد ہجرت ثانیہ کا قافلہ قرار دیتے ہیں۔

ہجرت مدینہ

بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہجرت کرنے کا اذن ملا تو پہلے اپنے اصحاب کو مدینہ جانے کی اجازت دی۔ صحابہ فرداً فرداً اور اپنے ہم قبیلہ ساتھیوں کے ساتھ مل کر جانے لگے تو حضرت عمرو بن ابوسرح نے بھی شہر نبی کا رخ کیا۔ مدینہ میں وہ قبیلہ اوس سے تعلق رکھنے والے حضرت کلثوم بن ہدم کے مہمان ہوئے، جن کا گھر مدینہ کی مضافاتی بستی قبا میں واقع تھا۔ حضرت حمزہ، حضرت زید بن حارثہ، حضرت ابومرثد، ان کے بیٹے حضرت مرثد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ حضرت انسہ، حضرت ابوکبشہ بھی حضرت کلثوم کے پاس ٹھیرے۔ ۱۲/ ربیع الاول ۱۳/ نبوی کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کی معیت میں مدینہ تشریف لائے۔ آپ نے بھی حضرت کلثوم بن ہدم کے ہاں چار روز قیام فرمایا۔ دوسری روایات کے مطابق حضرت حمزہ حضرت اسعد بن زرارہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن خیثمہ کی مہمانی میں رہے۔

مہاجرین و انصار کی فہرست مواخات میں حضرت عمرو بن ابوسرح کا نام شامل نہیں۔

غزوات

حضرت عمرو بن ابوسرح نے غزوۂ بدر میں بھرپور شرکت کی، ان کے بھائی حضرت وہب بن ابوسرح بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان کے قبیلے بنو حارث بن فہر کے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت عمرو بن حارث (ابوعمرو)، حضرت سہیل بن بیضا اور حضرت صفوان بن بیضا بھی شریک معرکہ تھے۔ واقدی نے حضرت

عیاض بن زہیر کا اضافہ کیا ہے، جب کہ حضرت وہب بن ابو سرح کے بجاے بنو عامر کی شاخ بنو مالک بن حسل کے حضرت وہب بن سعد بن ابو سرح کا نام شامل کیا ہے (کتاب المغازی)۔ ابن ہشام، ابن جوزی اور ابن کثیر نے بھی حضرت وہب بن ابو سرح کا نام بیان نہیں کیا، جب کہ قاضی سلیمان منصور پوری نے شرکاے بدر میں حضرت عمرو اور حضرت وہب، دونوں بھائیوں کے نام لکھے ہیں (اصحاب بدر)۔

حضرت عمرو بن ابو سرح غزوۂ احد، غزوۂ خندق اور تمام غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔

وفات

حضرت عمرو بن ابو سرح کی وفات ۳۰ھ میں عہد عثمانی میں ہوئی۔

ازواج و اولاد

دو خواتین حضرت عمرو کے عقد میں آئیں: ان کی چچا زاد حضرت امامہ بنت عامر، ان کے بطن سے عبد اللہ پیدا ہوئے، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی بہن، انھوں نے عمیر کو جنم دیا۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن اسحٰق)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، معرفۃ الصحابۃ (ابو نعیم اصفہانی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، انساب الاشراف (بلاذری)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

لیلیٰ بنت ابو حثمہ رضی اللہ عنہا

نسب و نسبت

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ (شاذ روایت: خیثمہ) قبیلہ بنو عدی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے دادا کا نام حذیفہ (حذافہ: بلاذری) بن غانم تھا۔ مشہور روایت کے مطابق ان کی والدہ جزیرۂ عرب کے شمال میں آباد قبائل تنوخ (Saracens) سے قید کر کے لائی گئی تھیں، ان کا نام نہیں بتایا گیا۔ مصعب زبیری کا کہنا ہے کہ حضرت ابو جہم بن حذیفہ حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ کے ماں جایے تھے اور ان کی والدہ کا نام یسیرہ بنت عبد اللہ تھا، جو بنو عدی سے تعلق رکھتی تھیں (نسب قریش ۳۷۰)۔ حضرت سلیمان بن ابو حثمہ حضرت لیلیٰ کے سوتیلے بھائی تھے۔ ان کی

والدہ کا نام حضرت شفا بنت عبد اللہ تھا جو جھاڑ پھونک میں شہرت رکھتی تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس کی اجازت دے رکھی تھی۔

ام عبد اللہ حضرت لیلیٰ کی کنیت تھی، وہ عدویہ و قرشیہ کی نسبتوں سے مشہور تھیں۔

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ کی شادی اسلام کے ابتدائی دور میں حضرت عامر بن ربیعہ سے ہوئی جو عنز بن وائل کی اولاد ہونے کی نسبت سے عنزی اور حضرت عمر کے والد خطاب بن نفیل کے حلیف اور متبنیٰ ہونے کی وجہ سے عامر بن خطاب کہلاتے تھے، تا آنکہ اللہ کی طرف سے حقیقی نسبت سے پکارنے کا حکم آ گیا۔

سبقت الی الاسلام

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ اولیں مسلمانوں میں سے تھیں۔ ان کے شوہر حضرت عامر بن ربیعہ نے زمانۂ جاہلیت کے موحد زید بن عمرو بن نفیل سے سن رکھا تھا: میں نے اپنی قوم کی مخالفت کر کے ملت ابراہیم کی پیروی کی ہے اور اب اولاد اسمٰعیل، بنو عبد المطلب میں ایک نبی کی آمد کا انتظار کر رہا ہوں، میں نہیں جانتا کہ ان کا زمانہ پاؤں گا۔ میں ان کی نشانیاں بیان کیے دیتا ہوں، تم انھیں دیکھ لو تو میرا اسلام کہنا، اس لیے انھیں اسلام کی طرف سبقت کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا اور وہ آپ کے دار ارقم میں تشریف لانے سے پہلے نور ایمان سے منور ہوئے۔ حضرت لیلیٰ بھی آپ کے دست مبارک پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

حبشہ کی ہجرت اولیٰ

رجب ۵/ نبوی: حضرت عامر، حضرت ابو سلمہ اور حضرت عثمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فریاد کی: یارسول اللہ، ہماری قوم نے ہمیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: حبشہ کی طرف نکل جاؤ، وہاں ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں ظلم نہیں ہوتا، وہ سچائی کی سرزمین ہے۔ چنانچہ حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ اپنے شوہر حضرت عامر بن ربیعہ کے ساتھ حضرت عثمان بن عفان کی قیادت میں حبشہ جانے والے قافلے میں شامل ہوئیں جو بارہ اصحاب، حضرت عثمان، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت ابو سبرہ بن ابو رہم، حضرت حاطب بن عمرو، حضرت سہیل بن بیضا، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور چار صحابیات، حضرت رقیہ بنت رسول اللہ (زوجہ حضرت عثمان)، حضرت سہلہ بنت سہیل (اہلیہ حضرت

ابو حذیفہ)، حضرت ام سلمہ بنت ابو امیہ (زوجہ حضرت ابو سلمہ)، حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ (اہلیہ حضرت عامر) پر مشتمل تھا۔ ابن جوزی نے حضرت عبد اللہ بن بیضا کے نام کا اضافہ کیا ہے۔

حضرت عامر کے حلیف اور منہ بولے بھائی عمر بن خطاب میاں بیوی پر بہت سختی کرتے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ دونوں دوسرے اصحاب کے ساتھ مل کر مکہ سے نکلنے کی تیاری کر رہے ہیں تو انھیں ملنے کے لیے آئے۔ حضرت لیلیٰ سفر حبشہ کے لیے اونٹنی پر سوار تھیں، عمر نے پوچھا: ام عبد اللہ، کہاں جا رہی ہو؟ انھوں نے کہا: آپ نے ہمیں دین اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ایذائیں دیں، اس لیے ہم اللہ کی سرزمین میں جا رہے ہیں جہاں ہمیں اللہ کی بندگی کرنے پر تکلیف نہ دی جائے گی۔ انھوں نے دعا کی: اللہ تمھارے ساتھ ہو، پھر چل دیے۔ اس اثنا میں ان کے شوہر حضرت عامر آ گئے۔ حضرت لیلیٰ نے انھیں عمر کے لہجے میں اچانک آ جانے والی نرمی کا بتایا۔ حضرت عامر نے پوچھا: تمھیں امید ہے کہ عمر اسلام قبول کر لیں گے؟ کہا: ہاں۔ حضرت عامر نے جو عمر کے سخت رویے سے نالاں تھے، جواب دیا: بخدا، وہ ایمان نہ لائیں گے جب تک ان کے والد خطاب کا گدھا مسلمان نہ ہو جائے (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۹۵۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۲۰۵۷۰)۔ اللہ کا کرنا ہوا کہ مہاجرین کو حبشہ گئے چند ہفتے گزرے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوئی اور حضرت عمر ایمان لے آئے۔

رات کے پچھلے پہر نہایت راز داری کے ساتھ یہ قافلہ بحر احمر کی بندر گاہ شعیبہ پہنچا۔ خوش قسمتی سے یہاں دو تجارتی کشتیاں حبشہ جانے کے لیے تیار تھیں، نصف دینار کرایہ کے عوض عازمین ہجرت ان میں سوار ہو گئے۔ ''طبقات ابن سعد'' اور ''تاریخ طبری'' میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ کرایہ تمام سواریوں کا تھا یا فی سواری نصف دینار طے ہوا تھا۔ مشرکین مکہ ان کا پیچھا کرتے کرتے بندر گاہ پہنچے، لیکن تب تک کشتیاں اللہ کے ان بندوں کو لیے کھلے سمندر میں حبشہ کی جانب رواں دواں ہو چکی تھیں۔ شعیبہ مکہ مکرمہ اور جدہ کے جنوب میں ساٹھ سے زیادہ میل کی مسافت پر واقع قدیم عرب کی مرکزی بندر گاہ تھی۔ ۲۶ھ میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان اہل مکہ کی درخواست پر خود تشریف لائے اور ساحل کا معاینہ کرنے کے بعد بندر گاہ جدہ منتقل کرنے کا حکم دیا۔ شعیبہ اس وقت بھی سعودی عرب کا اہم اقتصادی مرکز ہے۔ یہاں سمندری پانی کو صاف کرنے کا عرب دنیا کا سب سے بڑا پلانٹ ہے اور یہاں پٹرول سے بجلی بھی بنائی جاتی ہے۔

قافلے میں حضرت مصعب بن عمیر کی شمولیت

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ بیان کرتی ہیں: ہم حبشہ جانے کے لیے جمع تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: مصعب بن عمیر آج شب حبشہ کے لیے نکلنا چاہتا ہے، لیکن اس کی والدہ نے اسے روک لیا ہے۔ آپ کے ارشاد پر حضرت مصعب نے ایک رات حضرت عامر بن ربیعہ کے ہاں گزاری اور اگلی رات چپکے سے ان کے قافلے میں شامل ہو گئے۔ حضرت مصعب پیدل چل رہے تھے اور ان کے قدموں سے خون رس رہا تھا، حضرت عامر نے جو اونٹ پر سوار تھے، اپنی جوتیاں اتار کر ان کو دے دیں۔ حضرت عامر اور حضرت لیلیٰ کے پاس پندرہ دینار تھے اور حضرت مصعب کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس روایت کے مطابق جو کشتی انھیں ملی یمن کے ساحل مور سے مکئی لاد کر لائی تھی، مکئی اتار کر وہ انھیں مور لے گئی، مور سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے (الآحاد والمثانی، ابن ابی عاصم، رقم ۳۴۶۹)۔

حبشہ کی ہجرت ثانیہ

شوال ۵ھ: قریش کے مسلمان ہونے کی افواہ سن کر حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ اور حضرت عامر بن ربیعہ مکہ لوٹ آئے۔ مکہ میں داخل ہونے کے بعد قریش کا ظلم و تشدد کا سلسلہ زیادہ شدت کے ساتھ پھر شروع ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار دگر حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ حضرت لیلیٰ اور ان کے شوہر حضرت عثمان اور دیگر صحابہ کی معیت میں دوبارہ حبشہ ہجرت کر گئے۔ چند سال حبشہ میں گزار کر میاں بیوی اور کئی اصحاب مکہ واپس آ گئے۔

مدینہ کی طرف تیسری ہجرت

حبشہ سے دوسری بار واپس آنے پر بھی اہل ایمان کی زندگی دوبھر تھی۔ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا: مجھے تمھارے دار ہجرت کی خبر دے دی گئی ہے، جو یثرب ہے، جو مکہ سے نکلنا چاہتا ہے، وہاں چلا جائے۔ چنانچہ صحابہ مل جل کر چوری چھپے وہاں جانے لگے۔ حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد سب سے پہلے مدینہ پہنچے، ان کے بعد حضرت عامر بن ربیعہ کی اپنی اہلیہ حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ کے ساتھ آمد ہوئی۔ حضرت لیلیٰ پہلی صحابیہ تھیں جو مدینہ وارد ہوئیں (مستدرک حاکم، رقم ۶۸۹۴)۔ حضرت عبداللہ بن عامر فرماتے ہیں: میری والدہ سے پہلے کوئی بھی پردہ نشیں خاتون ہودے میں بیٹھ کر مدینہ نہیں آئیں۔ ہجرت کے اس تیسرے سفر میں، میں ان کے ساتھ تھا۔ دوسری روایت کے مطابق ام المومنین حضرت ام سلمہ نے سب سے پہلے مدینہ ہجرت کی۔ حضرت عامر بن ربیعہ کہتے ہیں: ابوسلمہ کے بعد مدینہ میں مجھ سے پہلے کوئی مہاجر

نہیں آیا اور لیلیٰ بنت ابو حثمہ سے پہلے کسی خاتون نے مدینہ ہجرت نہیں کی، یعنی حضرت ابو سلمہ پہلے مرد مہاجر اور حضرت لیلیٰ پہلی عورت مہاجرہ تھیں۔

پھر صحابہ جوق در جوق شہر ہجرت آنے لگے، حتیٰ کہ مکہ میں مریضوں اور ضعیفوں کے سوا کوئی نہ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کو اپنے بستر پر سلا کر حضرت ابو بکر کے ہم راہ یکم ربیع الاول ۱۳/ نبوی (۱۳/ ستمبر ۶۲۲ء) کو مکہ سے روانہ ہوئے۔

انصار کا حسن سلوک

حضرت لیلیٰ اور اُن کا خاندان سب سے پہلے مدینہ ہجرت کرنے والے چند مسلمانوں میں سے ایک تھا۔ جب انصار کو ان کے دو مرتبہ حبشہ ہجرت کا علم ہوا، تو اُن کے ساتھ نہایت عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔ حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ، حضرت سلمہ بن عبد الاسد اور ان کے فوراً بعد مدینہ پہنچنے والے حضرت عبد اللہ بن جحش اور حضرت ابو احمد بن جحش مدینہ کی مضافاتی بستی قبا میں جو قبیلہ بنو عمرو بن عوف کا مسکن تھا، حضرت مبشر بن عبد المنذر کے ہاں مقیم ہوئے۔

حضرت لیلیٰ کے مناقب

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ شجاعت، جرأت اور عزیمت کا مثالی پیکر تھیں۔ شادی کے بعد اپنے شوہر کے قدم بہ قدم ہر آزمایش میں پوری اُتریں۔ حضرت لیلیٰ اور اُن کے شوہر نے غزوۂ بدر سے غزوۂ تبوک تک، تمام غزوات میں بھرپور شرکت کی۔ حضرت عمر کے قبول اسلام میں جہاں اُن کی بہن فاطمہ بنت خطاب کا حصہ ہے، وہیں حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ کی مسلسل کاوشیں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ حضرت لیلیٰ کو دو قبلوں، بیت المقدس اور بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

بچے کو پرچانا یا جھوٹ بولنا

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عامر بتاتے ہیں: میں چھوٹا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے۔ میں کھیلنے کے لیے باہر جانے لگا تھا کہ میری والدہ پکاریں: عبد اللہ، آؤ میں تمھیں کچھ دوں۔ آپ نے دریافت فرمایا: تم اسے کیا دینا چاہتی ہو؟ انھوں نے بتایا: کھجور۔ آپ نے فرمایا: اگر تم اسے کچھ نہ دیتی تو تمھارے ذمہ ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا (ابو داؤد، رقم ۴۹۹۱۔ احمد، رقم ۱۵۷۰۲۔ السنن الکبریٰ،

بیہقی، رقم ۲۰۸۳۹)۔

اولاد

حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ کے ایک ہی بیٹے حضرت عبداللہ بن عامر کا ذکر ملتا ہے، انھی سے وہ کنیت کرتی تھیں۔ حضرت عبداللہ کی شادی بھی بنوعدی میں ہوئی۔

روایت حدیث

حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ سے کوئی روایت مروی نہیں۔

وفات

حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ کا سن وفات معلوم نہیں۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، انساب الاشراف (بلاذری)، الآحاد والمثانی (ابن ابی عاصم)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، Wikipedia۔

[باقی]

مشفق سلطان

ہندو مت اور تصور نبوت؟

(۱)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

بظاہر ہندو مذہب کے بارے میں یہ تاثر موجود ہے کہ اس میں نبوت کا تصور نہیں پایا جاتا۔ ہندو عوام اور اہل علم بھی تصور نبوت سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے ہاں دو تصورات کی زیادہ شہرت ہے: ایک 'رشی' کا تصور اور دوسرا 'اوتار' کا تصور۔ 'رشی' کا تصور اصولی طور پر ایک صوفیانہ تصور ہے، جس کے مطابق ایک شخص دھیان اور تپسیا کے ذریعے سے اعلیٰ مراتب کے حصول کے بعد حقیقت سے متعارف ہو جاتا ہے:

A general term for a 'seer' or 'sage', the word ṛṣi is often applied in the earlier literature of Hinduism to one of a set of important Vedic visionaries who literally saw with a special psychic perception the sacred mantras upon which they meditated and finally communicated in the form of the Veda- A traditional Sanskrit verse identifies a ṛṣi as a celibate performer of penance who controls his senses, is able to bless and curse, and is firmly devoted to telling the truth.[1]

۱-John Cush, Catherine Robinson, and Michael York, *Encyclopedia of Hinduism* (London: Routledge, 2008), 694.

''ہندومت کے ابتدائی دور کے ادب میں ایک عام اصطلاح ''رشی'' کا اطلاق ایک ایسے ''صاحب کشف'' یا ''حکیم'' پر ہوتا ہے جو وید سے تعلق رکھنے والے اہل نظر افراد کی قبیل میں شمار ہوتے ہیں۔ خاص روحانی بصارت کے ذریعے سے انھوں نے ان مقدس منتروں کا مشاہدہ کیا جن پر وہ دھیان کرتے تھے اور بالآخر انھیں وید کی صورت میں بیان کیا۔ ایک سنسکرت شعر کے مطابق، رشی وہ ہوتا ہے جو برہمچاری ہو، تپسیا کرتا ہو، اپنے حواس کو قابو میں رکھتا ہو، برکت اور لعنت دینے کی طاقت رکھتا ہو اور سچ بولنے میں پختہ ہو۔''

'اوتار' کی معروف تفہیم کے مطابق جب جب زمین پر دھرم (دین) کا تنزل ہوتا ہے اور ادھرم (بے دینی) کا عروج ہوتا ہے، تب تب نیک لوگوں کو بچانے، دُشٹ (برے) لوگوں کے خاتمے اور دھرم کو قائم رکھنے کے لیے ذات باری کا زمین پر ظہور ہوتا ہے[۲]۔ اوتار کے تصور کا جائزہ ہم آگے کے ابواب میں لیں گے۔

ہندو مذہبی متون کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین کے جو حقائق صرف ایک نبی کے ذریعے سے معلوم ہو سکتے ہیں، مثلاً جنت و دوزخ کا تصور اور ان کے داخلی احوال، فرشتوں کا تصور، قیامت کی نشانیاں وغیرہ، وہ ہندوؤں کے ہاں اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اہل ہنود کس نبی کے پیروکار ہیں یا ان پر کس نبی کی تعلیمات کے اثرات ہیں؟

ہندو مذہبی کتابوں کے مطالعہ کے دوران میں ایک شخصیت کچھ جانی پہچانی محسوس ہوتی ہے۔ اس شخصیت کا نام ہے 'منو' (Manu) یا زیادہ متعین طور پر 'منو ویوسوت' (Manu Vaivasvat)۔ ان کے بارے میں ایک کہانی ملتی ہے، جس میں لکھنے والوں کا تخیل بھی شامل ہوا ہے۔ ویدوں میں کئی مقامات پر لفظ 'منو' ملتا ہے، لیکن ان سے متعلق کوئی تفصیلی واقعہ ان میں بیان نہیں ہوا۔ صرف چند اشارات موجود ہیں۔ یہ شخصیت ابراہیمی روایت کے اولوالعزم پیغمبر سیدنا نوح علیہ السلام سے مشابہت رکھتی ہے۔

''شتپتھ براہمن'' کی داستان

سب سے پہلے ایک مفصل کہانی کا تذکرہ ''شتپتھ براہمن'' (Shatpath Brahman) نامی کتاب میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ''شکل یجروید'' (Shukla Yajurveda) کی مستند شرح سمجھی جاتی ہے، جس میں اصلاً ''یجروید'' میں موجود 'کرم کانڈ'، یعنی تعبدی امور خاص طور پر مختلف یگیوں[۳] کی تفصیلات ہیں۔ بعض داخلی

۲۔ بھگود گیتا، ادھیائے ۴، اشلوک ۷-۸ کی معروف تفہیم۔

۳۔ Yajna

شواہد کی بنیاد پر اہل علم کی بہت محتاط آرا ہیں کہ اس کی تصنیف کا زمانہ ۱۲۰۰ قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔

شتپتھ براہمن کانڈا، ادھیائے ۸، براہمن ۱، میں منو کی کہانی بیان ہوئی ہے۔

”صبح سویرے جب منو کے سامنے وضو کے لیے پانی لایا گیا، تو ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ مچھلی نے ان سے بات کی اور کہا کہ میری حفاظت کریں اور میں آپ کی حفاظت کروں گی۔ منو نے پوچھا کہ وہ کس سے ان کے حفاظت کرے گی؟ مچھلی نے جواب دیا: ایک بڑا طوفان ان تمام مخلوقات کو بہا لے جائے گا۔ میں تمھیں اس سے بچا لوں گی۔ منو نے پوچھا کہ سیلاب سے ان کی حفاظت کس طرح ہو گی؟ مچھلی نے کہا کہ جب تک ایک مچھلی چھوٹی ہوتی ہے تب تک انھیں بڑی مچھلیوں سے خطرہ رہتا ہے۔ اس لیے جب تک میں چھوٹی ہوں تب تک مجھے ایک چھوٹے کھڈ میں رکھیے۔ پھر جب میں بڑی ہو جاؤں تو مجھے سمندر میں لے جائیں۔ جب وہ مچھلی بڑی ہو گئی تو اس نے منو سے کہا کہ فلاں سال میں ایک طوفان آئے گا۔ اس لیے آپ ایک کشتی تعمیر کریں اور جب سیلاب کا پانی چڑھنے لگے تو آپ کشتی میں سوار ہو جائیں۔ میں آپ کو طوفان سے نجات دوں گی۔ منو نے اس مچھلی کی حفاظت اسی طرح کی اور بالآخر اسے سمندر میں لے گیا۔ پھر مچھلی کی ہدایت کے مطابق منو نے کشتی تعمیر کی۔ جب طوفان آیا تو منو کشتی میں سوار ہوئے۔ انھوں نے مچھلی کے سینگ کے ساتھ کشتی کو باندھ دیا اور کشتی شمالی پہاڑ کی جانب بڑھی۔ اس کے بعد مچھلی نے ان سے کہا کہ میں نے تمھیں طوفان سے بچا لیا ہے، تو اب تم کشتی کو ایک درخت کے ساتھ باندھ لو۔ پانی کی سطح کم ہونے پر منو شمالی پہاڑ پر کشتی سے اترے۔ اب طوفان نے تمام مخلوقات کو غرق کر دیا تھا اور منو تنہا رہ گئے۔ اس نے اولاد کی چاہت میں پوجا اور تپسیا کی۔ اس وقت پاک یگیہ[۴] بھی کیا اور گھی، دہی، مٹھی بھی پانیوں میں چڑھائے۔ تب ایک سال میں ایک عورت پیدا ہوئی۔ منو نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا: منو کی لڑکی۔ منو نے پوچھا کہ تو میری لڑکی کیسے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تو نے پانیوں میں جو گھی، مٹھی چڑھایا، اسی سے تو نے مجھے پیدا کیا۔ اب یگیہ میں میرا استعمال کر تا کہ تو بہت سے جانوروں اور اولاد والا ہو گا۔ جو بھی تو میرے ذریعے سے مانگے گا وہ سب تجھ کو ملے گا۔ اب منو اس کے ذریعے سے پوجا اور تپسیا کرتا رہا۔ اس کے ذریعے سے اس مخلوق کو پیدا کیا، جو منو کی اولاد ہے۔“

اس کہانی کے مطابق:

۴-*Pakayajna* (Sanskrit: पाकयज्ञ, romanized: Pāka-yajñās).

یہ ایک ہندو رسم ہے۔ یہ یگیہ کی ایک قسم ہے جو ویدک قربانیوں سے متعلق ہے، جس میں پکائے ہوئے کھانے کی قربانی پیش کی جاتی ہے، اور اسے ایک گھرانے کے سربراہ کے لیے ایک لازمی رسم سمجھا جاتا ہے۔

۱۔ منو انسانوں کی ایک قدیم نسل کے فرد تھے اور یہ نسل طوفان کے ذریعے سے صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی۔ کہانی کے مطابق منو شاید اپنے زمانے کے ایک غیر معمولی انسان تھے، جسے اس بربادی سے بچانے کے لیے منتخب کیا گیا۔

۲۔ ایک مچھلی کو ان کی نجات کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور دوسرے صحیفوں کی بنیاد پر بنے ہوئے ہندو عقیدے کے مطابق یہ مچھلی ذات باری کا اوتار تھی، جسے ہندو دیومالا میں 'متسیہ اوتار' (Matsya Avatar) کہتے ہیں؛ 'متسیہ' کے معنی مچھلی کے ہیں۔ یہاں اگر قرآن مجید کی روشنی میں ہم مچھلی کے اس کردار کو دیکھیں تو خدا نے اسے اپنا آلۂ کار بنا کر کشتی کو ٹھکانے پر پہنچا دیا۔

۳۔ صرف منو کو طوفان سے بچایا گیا۔ ''شتپتھ براہمن'' میں دوسرے لوگوں کا ان کے ہم راہ کشتی پر سوار ہونے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

۴۔ یہاں پر کشتی سے اترنے کے بعد منو کا پوجا اور یگیہ کرنے کا بیان ہے۔ یہ بیان بائیبل کی کتاب پیدایش کے ساتھ کچھ مطابقت رکھتا ہے۔ بائیبل میں ہے:

''پھر اس کے بعد نوح نے خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور پاک و حلال چند جانوروں اور پرندوں کو لے لیا اور اُن کو قربان گاہ پر لے جا کر قربان کر دیا۔ ان قربانیوں کی خوش بو خداوند کو بہت پسند آئی۔''

(پیدایش ۸: ۲۰-۲۱)

۵۔ ''شتپتھ براہمن'' کی کہانی میں منو کی طرف ایک معجزاتی لڑکی کو بھی منسوب کیا گیا ہے، جس کے ذریعے سے مخلوقات کی دوبارہ پیدایش ممکن ہوئی[۵]۔ یہ بات بائیبل اور قرآن، دونوں سے مختلف ہے۔

''مہابھارت'' کی روایت

''مہابھارت'' کے وَن پرو (Van Parv) جسے آرنیک پرو (Aranyak Parv) بھی کہتے ہیں، میں یہی

۵۔ یہاں پر اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ ہندو مذہبی کتب میں تمثیلات کا استعمال بکثرت ملتا ہے اور اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ ان تمثیلات کو حقیقت پر محمول کر بیٹھے ہیں۔ میرا احساس ہے کہ یہ ایسے ہی ہے، جیسے احادیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی اور جب اس سے فراغت ہوئی تو رحم نے عرض کیا کہ یہ اس شخص کی جگہ ہے جو قطع رحمی سے تیری پناہ مانگے (بخاری، رقم ۵۹۸۶)۔ یا یہ حدیث کہ قیامت کے دن موت ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی (بخاری، رقم ۴۷۳۰)۔

داستان تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ یہاں پر پورا اقتباس نقل کرنا موزوں نہ ہوگا، اس لیے ہم صرف ان نکات کا تذکرہ کریں گے جو ''شتپتھ براہمن'' کی داستان سے مختلف ہیں یا اضافی تفصیلات فراہم کرتے ہیں۔ اس روایت کے مطابق:

۱۔ مچھلی نے منو سے کہا کہ عالم کی تطہیر[6] کا وقت آیا ہے (مہابھارت، آرنیک پرو، ادھیائے ۱۸۵، اشلوک ۲۷)۔

۲۔ ''شتپتھ براہمن'' کی روایت کے خلاف مچھلی نے منو کو ہدایت کی کہ وہ کشتی میں 'سپت رشیوں'[7] کے ساتھ خود بھی سوار ہوں (ایضاً، اشلوک ۲۹)۔

۳۔ منو سے کہا گیا کہ طوفان کی متوقع تباہی کے پیش نظر وہ تمام عالم کی چیزوں کے بیجوں کو حفاظت کے ساتھ ترتیب وار کشتی میں رکھ لیں (ایضاً، اشلوک ۳۰)۔

۴۔ طوفان کے بعد جس پہاڑ پر کشتی اتری اور جس کے ساتھ باندھ دی گئی، اسے 'ہِم وَت' کہا گیا ہے اور چوٹی کا نام 'ناؤبندھن' بتایا گیا ہے (ایضاً، اشلوک ۴۷)۔

۵۔ تب اس مچھلی نے وہاں موجود منو اور سات رشیوں سے کہا کہ مجھے ہی پرجاپتی کہتے ہیں اور میرا ہی نام برہما ہے۔[8] میرا پار کوئی نہیں پا سکا۔ میں نے مچھلی کی صورت اختیار کر کے آپ لوگوں کو اس آفت سے چھڑایا ہے۔

ویدوں کے چند اشارات

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ویدوں میں منو سے متعلق کوئی تفصیلی واقعہ بیان نہیں ہوا ہے، صرف اشارات موجود ہیں۔ ذیل میں چند منتر پیش خدمت ہیں:

या वो भेषजा मरुतः शुचीनि या शन्तमा वर्षणो या मयोभु ।
यानि मनुरवृणीता पिता नस्ता शं च योश्चरुद्रस्य वश्मि ।।

''مروتو، تمھاری جو پاکیزہ جڑی بوٹیاں ہیں، اور اے طاقت ور مروتو، جو شفا بخشنے والی اور جو راحت دینے والی دوائیاں ہیں، جن دوائیوں کو ہمارے پتا منو نے قبول کیا تھا، ان رودر کے شفا بخش اور امراض کو دور کرنے

۶۔ یہاں سنسکرت لفظ (प्रक्षालन) ہے، جس کا اصل مطلب ہے: کسی چیز کو دھونا۔

۷۔ سپت رشی: یعنی سات رشی۔ ہندو روایت کے مطابق۔

۸۔ یہ نکتہ اہم ہے، کیونکہ بتدریج اوتار کے تصور میں ارتقا ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس مچھلی کو برہما کے بجائے وشنو کا ظہور تسلیم کیا گیا۔

والی دوائیوں کو میں چاہتا ہوں۔‘‘(رگ وید منڈل ۲، سوکت ۳۳، منتر ۱۳؛ہندی ترجمہ از پنڈت دامودر ساتولیکر)

یہاں غالباً ان شفا بخش جڑی بوٹیوں کی جانب اشارہ ہے جن کے بیجوں کو منو نے کشتی میں محفوظ کر لیا تھا اور جن کا تذکرہ بعد میں مہابھارت کی کہانی میں کیا گیا ہو۔

नस्त्राध्वं ते.अवत त उ नो अधि वोचत |
मा नः पथः पित्र्यान मानवादधि दूरं नैष्ट परावतः ||

’’ہے دیوو، ہمیں تم بچاؤ، ہماری حفاظت کرو، ہمیں ہمیشہ نصیحت کرو، اور ہمارا پالن کرنے والا جو باعث خیر راستہ ہے، ہمیں اس سے دور گم راہی کی اور رغبت نہ دو۔‘‘

(رگ وید منڈل ۸، سوکت ۳۰، منتر ۳؛ہندی ترجمہ از پنڈت دامودر ساتولیکر)

اس منتر کی اصل سنسکرت عبارت میں ’’پتھ پِتریات مانوات‘‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں پنڈت ساتولیکر نے اس کا ترجمہ ’’ہمارا پالن کرنے والا باعث خیر راستہ‘‘ کیا ہے۔ البتہ ویدوں کے مشہور مفسر آچاریہ ساین (Sayana) نے منتر کے اس فقرے پر لکھا ہے: ’’پِتا منو سے آئے ہوئے راستے سے‘‘۔ اور لکھا ہے ’’سَروِیشام پِتا‘‘، جو سب کے پدر ہیں۔ لفظ ’’دورم‘‘، یعنی ’’دور کا‘‘۔ اس پر لکھتے ہیں کہ ’’پِتا منو نے ایک دور راستے کا سفر کیا۔ اس راستے سے مختلف راستے کی اور ہماری رہنمائی نہ کرو‘‘۔ مزید لکھتے ہیں کہ ’’اس راستے کی ہدایت کرو جو پرہیز گاری، اگنی ہوتر کی قربانی اور دیگر دینی فرائض کا راستہ ہے‘‘۔

नि तवामग्ने मनुर्दधे जयोतिर्जनाय शश्वते |
दीदेथ कण्व रतजात उक्षितो यं नमस्यन्ति कर्ष्टयः ||

’’اے اگنی، جس کو سب انسان نمن کرتے ہیں، ایسے روشنی نما تجھ کو ازل سے انسانوں کے فائدے کے لیے منو نے قائم کیا۔ یگیہ میں ظاہر ہو کر اور یگیہ میں سیر ہو کر تو نے کنو کو شہرت دی۔‘‘

(رگ وید منڈل ا، سوکت ۳۶، منتر ۱۹؛ہندی ترجمہ از پنڈت دامودر ساتولیکر)

तवमग्ने वसून्रिह रुद्रानादित्यानुत |
यजा सवध्वरं जनं मनुजातं घर्तप्रुषम ||

’’اے اگنی، تو یہاں وَسُوؤں، رُدروں اور آدِتیوں کے اطمینان کے لیے یگیہ کر، اور بہترین یگیہ کرنے والے اور گھی کی آہوتی دینے والے منو سے پیدا ہوئے انسانوں کے اطمینان کے لیے بھی یگیہ کر۔‘‘

(رگ وید منڈل ا، سوکت ۴۵، منتر ا؛ہندی ترجمہ از پنڈت دامودر ساتولیکر)

ویدوں میں سے صرف چند منتروں کا حوالہ ہم نے یہاں دیا ہے، وگرنہ منو کا تذکرہ منتروں کی ایک کثیر تعداد

میں ہے، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ طوفان سے متعلق تفصیلی داستان ان میں موجود نہیں ہے۔

''بھگود گیتا'' میں منو

ویدوں، برہمنوں اور اپنشدوں کے بالمقابل ہندو عوام و خواص میں آج کل ''بھگود گیتا'' زیادہ مقبول ہے۔ ہندو روایت کے مطابق مہابھارت کی جنگ کے پس منظر میں شری کرشن (ان کے عقیدے کے مطابق ذات باری) کا ارجُن کو دیا گیا علم ہے، جسے ''گیتا'' کہا جاتا ہے۔ ''گیتا'' کا چوتھا باب اس طرح شروع ہوتا ہے:

श्रीभगवानुवाच
इमं विवस्वते योगं प्रोक्तवानहमव्ययम् ।
विवस्वान्मनवे प्राह मनुरिक्ष्वाकवेऽब्रवीत् ॥

''شری بھگوان نے کہا: یہ لافانی فلسفہ میں نے وِوسوان کو سکھایا۔ انھوں نے منو کو اور منو نے اِکشواکو کو سکھایا۔'' (اشلوک ۱؛ اردو ترجمہ از حسن الدین احمد؛ ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۱۹۹۷ء، نئی دہلی)

ان حوالہ جات سے یہ بات متبادر ہوتی ہے کہ اہل ہند وِوسوان کے بیٹے منو، (یعنی منو ویوسوت) کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کی کہانی سیدنا نوح علیہ السلام کی کہانی کے مماثل ہے، گو کہ تفصیلات میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ خدا کے ایک جلیل القدر نبی سے اہل ہند واقف ہیں، چاہے انھیں ان کے نبی ہونے کی حیثیت کا علم نہ ہو۔ ''مہابھارت'' کی کہانی کے مطابق جس مچھلی نے منو اور ان کے ساتھ سات رشیوں کو طوفان سے بچایا، اس نے بالآخر اپنے آپ کو برہما (ذات باری) کا جسدی ظہور قرار دیا۔ اسی طرح کے بیانات سے ہندو مذہب میں 'اوتار' کا تصور پیدا ہوا ہے، جس کا جائزہ ہم اگلے حصے میں لیں گے اور دیکھیں گے کہ اس تصور کا نبوت کے تصور کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے، نیز قرآن مجید کی روشنی میں اس تصور کی کیا توجیہ ممکن ہے۔

[باقی]

کوکب شہزاد

عدت اور چند مسائل

عدت کا مطلب ہے: گننا۔ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال دو قسم کی خواتین کے لیے ہوا ہے۔ ایک مطلقہ[1] کے لیے اور دوسرا بیوہ[2] کے لیے۔ طلاق یافتہ خاتون کی عدت تین حیض بتائی گئی ہے اور بیوہ کی عدت چار مہینے اور دس دن مقرر کیے گئے ہیں، یعنی طلاق یافتہ خاتون تین حیض مکمل ہونے تک شادی نہیں کر سکتی اور بیوہ چار مہینے دس دن تک شادی نہیں کر سکتی۔

عدت کا صرف اور صرف مطلب یہ ہوتا ہے کہ مطلقہ اور بیوہ کا اگر حمل ہے تو وہ واضح ہو جائے اور اگر ان خواتین کے پیٹ میں بچہ ہے تو اس کی نسبت واضح طریقے سے معلوم ہو جائے۔

بیوہ کی عدت مطلقہ سے زیادہ اس لیے ہے کہ طلاق دینے کا طریقہ اسلام نے یہ بتایا ہے کہ خاتون جسے طلاق دینا مقصود ہو، اسے حیض کے گزرنے کے بعد جو پاکیزگی کے ان ایام میں طلاق دی جائے جن میں میاں بیوی کا ملاپ نہ ہوا ہو۔ جب کہ یہ واضح ہوتا ہے کہ ان عدت کے ایام میں حمل نہیں ہو سکتا، جب کہ بیوہ کے شوہر کا انتقال ہوتا ہے اور ان میں دنوں کی گنتی متعین نہیں ہوتی۔ چنانچہ حمل واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مدت کو بڑھا دیا ہے۔

مطلقہ کی عدت

سورۂ بقرہ میں آیت ہے:

۱۔ جسے طلاق دے دی گئی ہو۔

۲۔ جس کا شوہر فوت ہو چکا ہو۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ.(۲:۲۲۸) ”اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار کرائیں۔“

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو شادی کرنے سے تین حیض تک روکے رکھیں تاکہ مطلقہ کے بارے میں پوری طرح واضح ہو جائے کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ چاہے خاتون آئسہ مدخولہ ہو یا ایسی خاتون ہو جسے ابھی حیض نہ آیا ہو یا پھر حیض آنے بند ہو چکے ہوں۔ ہر طرح کی صورت حال میں اس عرصے میں حمل ہونے یا نہ ہونے کا امکان پوری طرح سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور اگر حمل واضح ہو جائے تو پھر مطلقہ کی عدت وضع حمل ہو گی، یعنی بچے کی پیدایش تک عدت ہو گی، چاہے بچہ ایک مہینے کے بعد پیدا ہو یا طلاق ملنے کے نو مہینے کے بعد پیدا ہو۔ اصل مقصد وضع حمل ہے۔ بچے کی پیدایش کے بعد خاتون اپنے بارے میں فیصلہ لینے کے لیے آزاد ہے۔

لیکن اگر نکاح ہو گیا ہو اور میاں بیوی کا تعلق پیدا نہ ہوا ہو تو طلاق کی صورت میں کوئی عدت نہیں ہو گی، کیونکہ مطلقہ کے حمل کا کوئی امکان نہیں ہو گا، جس کے لیے عدت کی جائے۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ.(۳۳:۴۹) ”ایمان والو، جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرتے ہو۔“

عدت کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے چند احکامات دیے ہیں، جن کا خیال میاں بیوی، دونوں کو رکھنا چاہیے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ طلاق میں بیان کیا ہے:

۱۔ مطلقہ کو عدت کے دوران میں اپنے شوہر کے گھر میں رہنا چاہیے اور شوہر کو بھی اپنی مطلقہ کو اپنے گھر میں رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، شاید ان کے ایک دوسرے کے قریب رہنے سے اللہ تعالیٰ ان کے درمیان صلح کے امکانات پیدا کر دیں اور وہ پھر سے اکٹھے ہو جائیں۔ ایک ٹوٹتا ہوا گھر بچ جائے اور ان کے بچے در بدر کی ٹھوکریں کھانے سے بچ جائیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کے الٹ ہوتا ہے۔ جس خاتون کو طلاق ملتی ہے، وہ اب شوہر کے گھر میں ٹھیرنا اپنی خودداری اور انا کے منافی سمجھتی ہے اور اس کے گھر والے بھی اپنی بچی کو وہاں چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اور شوہر تو پہلے ہی الزامات کا پلندہ اپنی مطلقہ پر لگا چکا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دونوں خیر و برکت سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں۔

۲۔ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس کی بیوی اس کے گھر رہ کر عدت گزارنا چاہتی ہے تو وہ اس کی رہایش اور

نان و نفقے کا اپنی حیثیت کے مطابق انتظام کرے اور اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے۔

۳۔ مطلقہ کی سب سے اہم ذمہ داری ہے کہ ان تین مہینوں کے دوران میں اس پر اپنا حمل واضح ہو گیا ہے تو محض جان چھڑانے کے لیے اسے اپنے شوہر، یعنی بچے کے باپ اور سسرال والوں سے نہ چھپائے اور پوری صورت حال ان پر واضح کرے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (۲:۲۲۸)

”اور (یہ دوسری صورت پیدا ہو جائے تو) جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار کرائیں۔ اور اگر وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُن کے پیٹ میں پیدا کیا ہے، اُسے چھپائیں۔ اور اُن کے شوہر اگر معاملات کی اصلاح چاہیں تو اِس (عدت کے) دوران میں زیادہ حق دار ہیں کہ اُنھیں لوٹا لیں اور (یہ اِس لیے ہے کہ اِس میں تو شبہ نہیں کہ) اِن عورتوں کے لیے بھی اُسی طرح حقوق ہیں، جس طرح دستور کے مطابق اُن پر (شوہروں کے) حقوق ہیں، لیکن مردوں کے لیے (شوہر کی حیثیت سے) اُن پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ (یہ اللہ کا حکم ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔“

عدت گزارنے کے بعد خاتون آزاد ہے، وہ جہاں چاہے اپنی شادی کرے۔ سابقہ شوہر کو اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

بیوہ کی عدت اور اس کے بارے میں غلط فہمیاں

جس خاتون کا میاں فوت ہو جائے، اسے بیوہ کہتے ہیں اور اس کی عدت اللہ تعالیٰ نے چار مہینے اور دس دن مقرر کی ہے۔ بعض اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیوہ کے شوہر کے مرنے کی وجہ سے عدت میں سوگ بہت

زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اس کی مدت چار مہینے دس دن مقرر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں سوگ منانے کا عنصر نہیں، بلکہ طلاق کی عدت کم ہونے اور بیوہ کی عدت زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا یہ طریقہ بتایا کہ طلاق حیض ختم ہونے کے بعد پاکیزگی کے ان ایام میں دی جائے جن میں میاں بیوی کا تعلق قائم نہ ہوا ہو۔ اور اس کے بعد خاتون تین حیض تک شادی نہیں کرے گی۔ اور ان تین حیض کے عرصے میں اگر شوہر اسے نہیں روکتا تو وہ آزاد ہے۔ وہ جس سے چاہے، شادی کر سکتی ہے، جب کہ بیوہ کے مرنے کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کرنا ممکن نہیں، اس لیے اس کی عدت کے دنوں کو بڑھا کر چار مہینے دس دن کر دیا گیا۔ شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ اگرچہ افسردہ ہوتی ہے، لیکن عدت کا افسردگی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب بھی حمل کا واضح ہونا ہے تاکہ بچے کی نسبت اپنے حقیقی والد سے ہو سکے۔ بچے کے خاندان، نسل اور وراثت کا صحیح تعین ہو سکے۔ اور چار مہینے دس دن تک وہ شادی نہیں کرے گی۔ عدت گزرنے کے بعد وہ آزاد ہے۔ وہ جہاں چاہے، شادی کرے اور شوہر کا خاندان اور اس کے میکے والے اس کی شادی کی مخالفت نہ کریں۔

بیوہ کی عدت کے دوران میں اس پر نام نہاد پابندیاں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ. وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

”اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اور تمھارے لیے اِس میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم اشارے کنایے میں نکاح کا پیغام اُن عورتوں کو دو یا اُس کو اپنے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اُن سے یہ بات تو کرو گے ہی۔ سو کرو، لیکن (اِس میں) کوئی وعدہ اُن سے چھپ کر نہ کرنا۔

اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِيۡٓ اَنۡفُسِكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُ ۚ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ.

(البقرہ ۲: ۲۳۴-۲۳۵)

ہاں، دستور کے مطابق کوئی بات، البتہ کہہ سکتے ہو۔ اور نکاح کی گرہ اُس وقت تک نہ باندھو، جب تک قانون اپنی مدت پوری نہ کرلے۔ اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اِس لیے اُس سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔''

ہمارے معاشرے میں بیوہ کی زندگی کو اجیرن کر دیا جاتا ہے۔

۱۔ بیوہ کو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عدت کے دوران میں گھر سے باہر قدم رکھے گی تو اس کے شوہر کو عذاب دیا جائے گا۔ یہ بالکل جاہلانہ بات ہے یہ بات وہی لوگ ہی کہہ سکتے ہیں جو قرآن مجید کی باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔

۲۔ بیوہ کو بڑی سخت پابندیوں میں رہتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عدت کے دوران میں کسی بھی کام کے لیے گھر سے نکلی تو جب وہ اپنے شوہر کی قبر پر اس کے لیے دعا کرنے جائے گی تو اسے اپنے شوہر کی قبر دکھائی نہیں دے گی، جو کہ سراسر غلط بات ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل تو وفات کے بعد خاتون اگر ملازمت کرتی ہے تو اسے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنی ملازمت پر جانا انتہائی ضروری ہے اور بھی کئی formalities کو پورا کرنے لیے گھر سے نکلنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے کہ وہ حمل کے واضح ہونے سے پہلے کسی ایسی جگہ پر اکیلی نہ جائے جہاں اس کے بچے کی نسبت پر الزام لگایا جاسکے۔

ہمارے ایک بہت ہی قریبی عزیز وفات پاگئے تو ان کی بیوہ نہ صرف یہ کہ کسی کے سامنے نہیں آتی تھیں، بلکہ اگر بیرون ملک سے ان کے کسی عزیز کا تعزیت کرنے کے لیے فون آتا تو وہ اس سے فون پر بھی بات نہیں کرتی تھیں تاکہ کوئی غیر محرم ان کی آواز نہ سن لے۔ یہ بالکل غیر ضروری پابندیاں ہیں اور ان کا ہمارے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ اپنے لوگوں کے لیے آسانیاں چاہتا ہے، مشکلات نہیں۔ ہمارے ہاں عدت کی غیر ضروری پابندیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بزرگ کافی عرصہ ہندوؤں کے ساتھ رہے۔ اور ان کے ہاں بیوہ کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بیوہ کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کسی لڑکی کی شادی کے موقع پر اگر کوئی بیوہ اس کو پیار کرنے لگتی ہے یا اس کے ہاتھوں پر منہدی لگانے کے لیے آگے

بڑھنے لگتی ہے تو اس کو روک دیا جاتا ہے۔

شوہر کی وفات کے فوراً بعد اس کی چوڑیوں کو جو اس نے پہنی ہوتی ہیں، فریضۂ منصبی سمجھتے ہوئے توڑ دیا جاتا تھا۔ اس بے چاری پر پہلے ہی آفت ٹوٹ پڑی ہوتی ہے مزید لوگوں کی زیادتیاں اسے ہوش و حواس میں نہیں رہنے دیتیں۔

ہندوستان میں بیوہ تاعمر سفید ساڑھی پہننے پر مجبور ہوتی ہے اور ظلم کی انتہا یہ کہ کافی صدیوں تک بیوہ کے سر کے بال مونڈھ دیے جاتے تھے تاکہ وہ کسی کے دل کو نہ بھائے۔ اسے کھانے پینے کو اتنا کم اور سادہ دیا جاتا اور زمین پر الگ تھلگ کمرے میں چارپائی پر سلایا جاتا اور بہت عرصے تک، بلکہ بھارت کے بعض علاقوں میں اب بھی اسے شوہر کی چتا میں دلہن بنا کر ستی کر دیا جاتا ہے۔ یہ تو انگریزوں کی مہربانی ہے کہ انھوں بہت ساری بے ہودہ رسموں کو بھارت میں ختم کیا، لیکن ہم ابھی بھی ان کی بعض رسموں کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم میں سے بہت سارے مسلمانوں کو پتا نہیں کہ عدت کا مقصد کیا ہے، اندھادھند ہم دوسروں کی نقل میں بگ ٹٹ بھاگتے چلے جاتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی بیوہ خاتون اپنے سسرال میں عدت گزار رہی ہے تو اسے سسرال کے ماحول میں بننے سنورنے سے احتراز کرنا چاہیے، لیکن اس بات کا تعلق سسرال والوں کے جذبات کا احترام کرنا ہے۔ یہ بات عدت کے شرائط میں سے نہیں۔ عدت کا اصل مقصد، جیسا کہ ہم بار بار کہہ رہے ہیں، حمل کا واضح ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ (۲: ۲۴۰) میں بیوہ کے حق میں بہت زبردست احکام دیے ہیں۔ اس بات کی وصیت ہر شوہر کو اپنی بیوی کے بارے میں دینی چاہیے۔ یہ وصیت اس میراث کے علاوہ ہے جو بیوی کو شوہر کی طرف سے ملتی ہے۔ ہمارا دین کتنا متوازن اور خوب صورت دین ہے۔ اس نے تو یہاں بیوہ کے حق میں کہا ہے کہ اگر بیوہ کی عدت کے دوران میں کوئی اسے شادی کا پیغام دینا چاہے تو اشارے کنایے میں پیغام دے سکتا ہے، لیکن ان کا نکاح تو عدت گزرنے کے بعد ہی ہو گا۔

کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہے جس کے ایک ایک حکم میں گہرا فلسفہ اور گہری منطق پائی جاتی ہو۔

اور اسی حکمت کے تحت اس نے مطلقہ اور بیوہ کی عدت مقرر کی ہے تاکہ حمل واضح ہو سکے، اس کے علاوہ عدت کی کوئی اور وجہ نہیں۔

ڈاکٹر عدیل احمد

قرآن اور ہمارے درمیان حائل رکاوٹیں

قرآن مجید دنیا کی سب سے اہم چیز ہے۔ یہ کائنات کے خالق اور مالک کا انسانوں کے نام آخری پیغام ہے۔ وہ لوگ جو اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے لیے بھی بنیادی انسانی جستجو کی بنا پر ہی سہی، اسے پڑھے بغیر کوئی چارا نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اسے کلام الٰہی مانتا ہے اور اس دعوے کو جانچنے کے لیے سب سے پہلا اور سب سے ضروری کام یہی ہے کہ اسے پڑھ کے دیکھا جائے۔ لیکن خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے اور انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے آخری بار دنیا میں بھیجا گیا ہے، اس کتاب سے زیادہ اہم اور قیمتی نہ کوئی چیز ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی کام۔ اس کے برعکس، واقعہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی ذاتی اور سماجی زندگی کے بیش تر معاملات اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ عمومی طور پر مسلمان اور قرآن کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ اس دوری کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے اور قرآن کے درمیان کچھ رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو جانی مانی ہیں، مثلاً ترجیحات کا غلط چناؤ، کم ہمتی، سستی، مفاد پرستی وغیرہ، لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ چند ایسی بھی دیواریں ہیں جو خالص نیک نیتی کے ساتھ اٹھائی گئی ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کے بارے میں جاننا زیادہ ضروری ہے، کیونکہ اول تو یہی عوام الناس کو زیادہ تر قرآن فہمی کی کوشش سے دور رکھتی ہیں اور دوسرے ان کا معاملہ سیدھا سیدھا سفید و سیاہ والا نہیں ہے اور ان کے حسن و قبح کو سمجھے بغیر ہم قرآن کے مطالعے کے سلسلے میں متوازن رویہ نہیں اپنا سکتے۔ یہ دیواریں ہیں: ناظرہ، ثواب اور تقدس کے حوالے سے ہمارے تصورات۔

ناظرہ سے مراد 'دیکھنا' ہے۔ اصطلاحاً قرآن کے معنی سمجھے بغیر محض عربی عبارت پڑھنے کو ناظرہ کہتے ہیں۔

جب تک قرآن ان لوگوں کے زیر مطالعہ رہا جنھیں اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے کسی ترجمے کی ضرورت نہیں تھی، دنیا ایک اصطلاح کے طور پر اس لفظ سے ناواقف تھی۔ گو اصلاً ناظرہ قرآن کے الفاظ اور آیات کے ساتھ روشناس ہونے کا ایک ذریعہ اور اس سلسلے کا پہلا مرحلہ تھا، لیکن بدقسمتی سے غالباً یہی وہ پہلی دیوار ثابت ہوئی جو بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں اور اس عظیم پیغام کے درمیان حائل ہوگئی۔ عربی زبان اور خاص طور پر قرآن کی عربی پڑھ لینے پہ قدرت رکھنا اور اس میں مہارت حاصل کر لینا یقیناً نہایت قابل ستایش ہے۔ لیکن یہیں رک جانا اور اس مشق کو اس عظیم سفر کی پہلی ہی نہیں آخری منزل بھی مان لینا، قرآن کے ساتھ ہمارا وہ تعلق کبھی پیدا نہیں ہونے دیتا جو اس الوہی پیغام کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

قرآن ناظرہ کا مرحلہ دراصل ایک اجنبی زبان سے مانوسیت پیدا کرنے اور بعد ازاں قرآن کی تلاوت میں روانی لانے کے لیے متعارف کرایا گیا تھا۔ غلط یہ ہوا کہ اسے قرآن پڑھنے کا متبادل سمجھ لیا گیا۔ لوگوں نے اتنا تو ضروری جانا کہ ان کے بچے قرآن کی تعلیم کا پہلا سبق حاصل کریں اور اس طرح اس کی تلاوت کرنے کے قابل ہو سکیں، لیکن یہ بھول گئے کہ اس سے زیادہ ضروری اس کا پڑھنا، یعنی سمجھنا ہے تاکہ اس کی ہدایات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اسی پہلے سبق پہ اڑے رہنے، اس سے آگے نہ بڑھنے اور یہیں سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دینے کا نتیجہ باقی کی ساری زندگی تلاوت کی ایک ایسی مشق کی صورت میں نکلتا ہے جس میں قاری کے پلے کچھ نہیں پڑتا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے، کجا یہ کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلوں اور انتخابات میں اس مطالعے سے مدد حاصل کرے۔

قرآن ناظرہ کے ساتھ جڑا ہوا ثواب کا تصور وہ دوسری چیز ہے جسے ہم نے اپنے اور قرآن کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل کر رکھا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ نہ تو ناظرہ قرآن کے پڑھنے میں کوئی حرج ہے اور نہ ہی اس کلام کے الفاظ کی تلاوت سے ملنے والے ثواب سے کوئی انکار کر سکتا ہے، لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ یہی نیکی، اور نیکی کا یہ تصور ہمارے لیے قرآن سے دوری کا سبب بن رہے ہیں۔ درحقیقت ثواب کمانے کا یہ لالچ ہم میں سے بہت سوں کو تلاوت سے آگے نہیں بڑھنے دیتا اور ہم جب بھی قرآن پڑھنے بیٹھتے ہیں، یہ ہمیں ترجمہ پڑھنے میں وقت صرف کرنے سے روکتا ہے تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ وقت عربی آیات کے پڑھنے میں لگائیں اور یوں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کر سکیں۔ اس کے برخلاف، نہایت ادب کے ساتھ راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جسے عربی کی اتنی بھی سدھ بدھ نہ ہو کہ وہ تلاوت کے دوران میں قرآن کی آیات سے معنی اخذ کر سکے، اگر زندگی میں ایک بار بھی شعوری کوشش نہیں کرتا کہ عربی زبان سیکھ کر

یا کسی ترجمے کی مدد سے قرآن کا مفہوم جان سکے، تو عین ممکن ہے کہ ہر بار جب وہ محض عربی پڑھتا ہے اور اس کا مطلب جاننے کی کوشش سے اعراض کرتا ہے تو کوئی نیکی کمانے کے بجاے قیامت والے دن اپنی پوچھ گچھ کو ہی مشکل بنا رہا ہو۔

اس سلسلے میں ایک عمومی رویہ یہ ہے کہ قرآن کے پیغام اور اوامر و نواہی سے متعلق چونکہ ہمیں پہلے سے ہی علم ہے۔ ہمارے والدین، اساتذہ، واعظین، علما اور خطیب ہمیں ایمان کے بنیادی شرائط، ارکان، اور ضروری اصول و مبادی سے متعلق تقریباً سبھی کچھ تو بتا چکے ہیں، بلکہ بار بار بتاتے رہتے ہیں۔ توحید رسالت، آخرت پر کامل یقین، نماز، روزے کی پابندی، حج، زکوٰۃ کی ادائیگی اور سچائی، امانت داری اور ایفاے عہد پر عمل اور جھوٹ، چوری، زنا، سود وغیرہ سے بچنا۔ غرض سب اچھی بری باتیں تو ہمیں معلوم ہی ہیں۔ انبیا کے قصے بھی سب سن رکھے ہیں، (بلکہ جتنا کچھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ہی سن رکھے ہیں)۔ پھر قرآن میں ایسی اور کیا بات ہو گی جس کے لیے ہم عربی پڑھنے کے ثواب کو داؤ پر لگا کر ترجمہ پڑھنے بیٹھ جائیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ایسے بہت سے نیک نیت اور مخلص لوگ جو کسی نہ کسی صورت میں دین کی تبلیغ سے وابستہ ہیں، وہ بھی قرآن مجید کو عملاً صرف ثواب کمانے ہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور دعوت کے کام میں، جسے وہ خود دین کی محنت سے تعبیر کرتے ہیں اور انبیا کے مشن کا تسلسل گردانتے ہیں، اس الوہی پیغام کے بجاے مختلف عبادات اور اعمال کے فضائل کی روایات کے سننے سنانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ در حقیقت قرآن ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت تھی اور اگر کوئی ایک پیغام ہمیں اپنی تمام جدوجہد، قربانی اور تگ و دو کے نتیجے میں لوگوں تک پہنچانے کا موقع ملے تو وہ یہی ہو سکتا ہے، اور ہونا چاہیے کہ اللہ کے اس کلام کو جو قلب رسول پر ہمارے لیے اترا ہے، پڑھیں؛ پڑھنا شروع کر دیں؛ زندگی بھر پڑھتے رہیں، کیونکہ اسے پڑھیں گے، اور سمجھیں گے تبھی اس کی ہدایات پر عمل کر سکیں گے اور پھر دوسروں کو اس سے جوڑنے کی کوشش کر پائیں گے۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس مفروضے کی بنیاد پر، چاہے اس میں کتنی ہی حقیقت کیوں نہ ہو، کہ اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے، ہمیں سب معلوم ہے، کوئی شخص جو یہ یقین رکھتا ہو کہ یہ واقعی اللہ کا کلام ہے، کیسے خود اپنی آنکھوں سے قرآن پڑھے بغیر، پڑھنے کی کوشش کیے بغیر ایک دن بھی گزار سکتا ہے۔ کجا یہ کہ ساری زندگی اس کتاب کی عبارت کو دیکھتے، اور سمجھے بغیر دہراتے رہنے میں گزار دی جائے اور کبھی یہ خیال تک نہ آئے کہ آخر خود بھی تو جاننا چاہیے کہ میرے مالک نے مجھ سے کیا بات کی ہے۔ فرض کیجیے، آپ کو کسی بڑے ادارے

کے مالک یا کسی سربراہ مملکت کی جانب سے ایک مراسلہ موصول ہوتا ہے۔ خط لانے والا ضروری ہدایات اور پیغام کا خلاصہ زبانی سمجھا دیتا ہے۔ آپ کو بتا دیتا ہے کہ آپ کو خط بھیجنے والی شخصیت سے ملنا ہے اور ملاقات میں چند ضروری سوالات ہوں گے، جو آپ کے لیے کسی بڑی سزا یا کسی بہت بڑے انعام کی صورت میں منتج ہو سکتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لفافہ کھول کر خط پڑھنے کی کوشش سے پہلے آپ کوئی بھی اور کام کریں گے؟ اور اگر یہ خط کسی ایسی زبان میں ہے جو آپ نہیں سمجھتے تو مجھے یقین ہے کہ جب تک کسی زبان دان سے آپ اس کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ نہیں سمجھ لیں گے، آپ کو چین نہیں آئے گا؛ ہو سکتا ہے کہ رات کو سو بھی نہ سکیں۔ تو پھر اس سب سے بڑی ہستی کی طرف سے ملنے والے سب سے بڑے پیغام کے لیے ہی ایسی بے پروائی اور بے خوفی کیوں؟

ایک اور رکاوٹ تقدیس کے تصور کی وہ عملی جھلک ہے جو ہمارے رویے میں نظر آتی ہے۔ قرآن دنیا اور مافیہا میں سب سے زیادہ مقدس کتاب ہے، اس امر میں کوئی شک نہیں، لیکن اس کی تعظیم کے لیے اختیار کیے گئے انداز ہی ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہو جائیں، یہ رویہ ناقابل فہم ہے۔ ہمارے گھروں میں قرآن مجید عام طور پر جزدان میں لپیٹ کر ایسی اونچی جگہوں پر رکھا جاتا ہے جو تقریباً ناقابل دسترس ہوتی ہیں۔ اگر کبھی قرآن پڑھنے کا خیال آ بھی جائے تو یہ طبعی دوری اور پیچ کے مرحلوں کا خیال سستی کو جذبے پر غالب آنے میں مدد دیتا ہے۔ پہلے وضو کیجیے، پھر کسی کرسی یا صوفے پر کھڑے ہو کر قرآن پاک اٹھائیں، جزدان سے نکالیں، جزدان کی دھول مٹی جھاڑ کر اسے ادب سے تہ کر کے رکھیں اور پھر تمیز سلیقے سے ترجیحاً قبلہ رو ہو کر بیٹھیں اور پڑھیں۔ اس کے مقابلے میں اپنی کسی نصابی کتاب کو لے لیں یا ایسی کوئی کتاب جس سے آپ اپنے کام، بزنس یا کسی ایسے معاملے میں رہنمائی حاصل کر رہے ہوں جو آپ کو درپیش ہے، یہ کتاب ہر وقت آپ کی رسائی میں ہو گی۔ عین ممکن ہے کہ آپ کے بستر کی سائیڈ ٹیبل پر دھری رہتی ہو تاکہ جب آپ سب کاموں سے فارغ ہو کر آرام کرنے لگیں تو سکون کے ساتھ اسے پڑھ سکیں۔ ہم قرآن کی بے توقیری یا بے ادبی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، لیکن ضروری ہے کہ تقدیس اور تعظیم کے اظہار کے لیے ایسے انداز اختیار کیے جائیں جو قرآن پاک تک ہماری رسائی کو آسان رہنے دیں اور اس سلسلے میں ارادہ شکن نہ ثابت ہوں۔

عوام الناس میں پایا جانے والا یہ خیال بھی کہ قرآن کو وضو کے بغیر چھوا نہیں جا سکتا جو قرآن ہی کی ایک آیت (الواقعہ ۵۶: ۷۹) کی تشریح سے اخذ کیا گیا ہے، ہمارے اور اس کتاب کے درمیان فاصلہ پیدا کرتا ہے،

حالاں کہ سیاق و سباق کا لحاظ رکھا جائے تو آیت نمبر ۷۵ سے ۷۹ تک اللہ تعالیٰ ستاروں کے غروب ہونے کے ٹھکانوں یا مواقع کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ ایک نہایت عزت اور تکریم والا قرآن ہے جو (اس کے ہاں) ایک محفوظ کتاب میں درج ہے اور اسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ یعنی شیاطین کی جانب سے اس میں ملاوٹ کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس سے ذرا آگے آیت نمبر ۸۱ پڑھیے تو ایسا لگتا ہے کہ زیر نظر مضمون کا خلاصہ ہے جو ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ اللہ فرماتا ہے: ''کیا اس پیغام کو تم معمولی سمجھتے ہو، اس سے بے پروائی برتتے ہو؟'' یعنی ایک ایسا کلام جو اللہ کے نزدیک انتہائی عزت والا ہے، جسے اس کے محافظ اور پاکیزہ فرشتے کسی بھی قسم کی آمیزش سے بچائے ہوئے لے کر آتے ہیں، جو ناپاک شیاطین کی دراندازی سے محفوظ ہے، تم اس سے مداہنت کا رویہ روا رکھتے ہو۔

آخر میں ہم اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں ایک گزارش، اور اگر ہماری اس گزارش کو مان لیا جائے تو اس پر عمل کو آسان بنانے کے لیے کچھ تجاویز پیش کریں گے۔

گزارش تو اتنی سی ہے کہ قرآن مجید کو تلاوت کے ساتھ ساتھ مطالعے کی کتاب بنائیے۔

اس مقصد کے لیے سب سے بہترین انداز تو یہ ہے کہ عربی کو ایک زبان کے طور پر سیکھا جائے، قرآن کی تاریخ اور آیات کے شان نزول سے واقفیت حاصل کی جائے، اور پھر قرآن کو ایسے پڑھا جائے کہ اس کے سمجھنے کے لیے کسی ترجمے یا تفسیر کی ضرورت نہ رہے، لیکن یہ لمبا سفر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی ملازمت، کاروبار یا دیگر مصروفیات کی وجہ سے اسے نہ اختیار کر سکیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اعتماد کریں۔ لوگوں نے اس سفر میں عمریں لگائی ہیں۔ قرآن فہمی کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے۔ علمائے کرام نے انتہائی محنت اور دقت نظر سے کام لیتے ہوئے سادہ ترین لفظی ترجمے، سلیس معانی اور بامحاورہ ترجمانی سے لے کر بہت تفصیلی تشریحات اور تفاسیر لکھی ہیں۔ یقین کر لیجیے کہ کسی مترجم یا مفسر نے بدنیتی سے کام نہیں لیا ہے۔ ہمیں بسا اوقات یہ خوف بھی قرآن کا ترجمہ پڑھنے سے روکتا ہے کہ نجانے کس مسلک اور کس مکتبۂ فکر کا نقطۂ نظر ہے، کہاں ڈنڈی ماری گئی ہے، کون کون سے اختلافی مسائل ہیں، کہیں ہدایت کے بجائے گمراہی نہ سمیٹ بیٹھیں۔ یہ خوف دل سے نکال دیجیے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ میں تیرے کلام کو سمجھنے کی اپنی سی کوشش کا آغاز کرنے لگا ہوں، مجھے سمجھا دے، ہدایت عطا فرما اور گمراہی سے بچا لے۔ پھر اپنے دل و دماغ سے وہ تمام نظریات اور عقیدے جو پہلے سے وہاں موجود ہیں، نکال کر احتیاط سے کہیں سنبھال لیں؛ ہر طرح کے تعصب کی عینک اتار کر پڑھنا شروع کریں۔

ہم تجویز کریں گے کہ ابتدا کے لیے کسی بہت سادہ اور مختصر ترجمے کا انتخاب کریں۔ کہیں کوئی سوال اٹھے، کوئی الجھن پیدا ہو تو بد دل نہ ہوں، پڑھتے جائیں، قرآن آگے کہیں خود اس کو حل کرے گا۔ اگر پہلی بار کے پڑھنے میں نہیں تو دوسری بار میں، اگر کسی ایک ترجمے میں نہیں تو کسی دوسرے ترجمے میں معاملہ صاف ہو جائے گا۔ بہت کم ایسا ہو گا کہ آپ کو وضاحت کے لیے کسی اہل علم سے رجوع لانا پڑے۔ قرآن ایک دفعہ کا مطالعہ نہیں ہے؛ یہ آپ کی زندگی بھر کی پڑھائی (life time study) ہے۔ اب جس جس نظریے اور عقیدے کے بارے میں قرآن اجازت دے، اسے اٹھا کر دوبارہ سے سرمایۂ دل و جاں بنا لیجیے، جسے رد کر دے، آپ بھی ہمت کر کے اسے ترک کر دیں اور جس کے بارے میں خاموش رہے، آپ بھی توقف اختیار کریں، جب تک مطالعے کے اس سفر میں معاملہ واضح نہ ہو جائے۔

اس طرح آپ اپنی زندگی میں قرآن کے مطالعے کو روزانہ دس منٹ دیں یا ایک گھنٹہ یا پھر ہفتہ وار کچھ وقت مخصوص کریں، لیکن یہ خیال رکھیں کہ تسلسل اور باقاعدگی برقرار رہے۔ بغیر اندیشہ کیے، نیک نیتی اور خوش گمانی کے ساتھ ہر قسم کا تعصب اور جانب داری بالاے طاق رکھ کر پڑھتے جائیں۔ مختلف مکاتب فکر کے مترجمین اور مفسرین کے کیے ہوئے ترجمے اور تشریحات پڑھتے پڑھتے آپ کو احساس ہو گا کہ قرآن اپنے معانی آپ پر کھول رہا ہے، آپ کلام کے لب و لہجے سے شناسا ہو رہے ہیں اور اس قابل ہوتے جا رہے ہیں کہ سمجھ سکیں کہ یہ عظیم ہدایت نامہ آپ کی نجی اور سماجی زندگی کے حوالے سے آپ سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔ اور خاص طور پر روز آخرت جب بڑی حاضری ہو اور اگر آپ کا رب آپ سے پوچھ لے کہ میں نے خاص تمھارے لیے جو پیغام بھیجا تھا، تم نے اسے پڑھا بھی یا نہیں، تو آپ شرمندگی سے بچ سکیں۔

شاہد رضا

اسلام کا مخاطب

[جناب جاوید احمد غامدی کی تحریروں، آڈیوز اور ویڈیوز سے اخذ و استفادہ پر مبنی سوال و جواب]

سوال: ایک نظام فکر کے لحاظ سے اسلام کا مخاطب فرد ہے یا قیادت؟

جواب: اسلام ایک پورا نظام فکر ہے، اس لیے جو لوگ بھی معاشرے میں قیادت کے منصب پر فائز ہوں گے، ان پر یہ پوری طرح اثر انداز ہو گا۔ وہ اگر قیادت کر رہے ہیں تو قیادت کس اصول پر کر رہے ہیں، یعنی اس میں کچھ عقائد ہوں گے، جن کی وہ نگہبانی کر رہے ہوں گے، کچھ اعمال ہوں گے جن کو وہ لوگوں میں رائج دیکھنا چاہتے ہوں گے تو ان میں سے ایک ایک چیز کو یہ مذہب یا اسلام یا پیغمبر آ کر ہدف تنقید بنائیں گے اور لوگ ان کی طرف آنا شروع ہو جائیں گے تو قیادت کا سارا قصر ہی گر جائے گا۔ چنانچہ قیادت صرف سیاسی نہیں ہوتی، بلکہ وہ فکری بھی ہوتی ہے۔

معاشرے میں دانش ور، مذہبی پیشوا اور سیاسی رہنما قیادت کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قیادت کچھ افکار پر کسی نصب العین کے حصول کے لیے کی جا رہی ہوتی ہے۔ سوسائٹی کی اقدار کی حفاظت کے لیے قیادت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا مذہب یا مذہبی تعلیمات اگر ان کو ہدف تنقید بنائیں گی تو ردعمل ہو گا۔ چنانچہ دنیا میں ایک لمبے عرصے تک شرک کو یہ حیثیت حاصل رہی ہے۔ شرک لوگوں کے لیے تہذیب اور مذہب رہا ہے۔ اسی کی بنیاد پر حکمران اپنا جواز پیدا کرتے رہے ہیں۔ جب آپ شرک کو موضوع بناتے ہوئے یہ کہیں گے کہ اس کی تو کوئی بنیاد ہی نہیں ہے، اصل چیز توحید ہے اور اس کائنات کا خالق تو تنہا خالق ہے تو اس کے اثرات ان تصورات پر پڑیں گے جن پر قیادت کھڑی ہے یا اس معاشرے پر پڑیں گے جو پورا شیرازہ بندی کا عمل کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ تو بہت

بڑے پیمانے پر ردعمل ہے، جو ناگزیر طور پر ہو گا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ان کی قیادت کو چیلنج کر دیں اور یہ کہیں کہ تمھاری جگہ ہم لینا چاہتے ہیں تو پھر وہ ردعمل میں جائیں گے، بلکہ قیادت کو چیلنج کرنے کا ایک پہلو وہ ہے جس میں آپ دوسرے کو کہتے ہیں کہ جگہ چھوڑو، میں تمھاری جگہ آ رہا ہوں۔ اس سے زیادہ گہرا اور بصیرت پر مبنی پہلو یہ ہے کہ وہ جن تصورات، عقائد، ثقافت اور تہذیب پر اپنی قیادت قائم کر کے کھڑا ہے، آپ اس کو تبدیل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے، جیسے آپ پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لیں۔

جس وقت مذہبی یا سیاسی معاملات میں آپ کوئی راے دیتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ راے تو موثر ہونا شروع ہو گئی، لوگ اس کو ماننا شروع ہو گئے اور ہمارے اپنے پیروکار سوالات کرنے لگ گئے تو اس میں کس کی قیادت چیلنج ہو رہی ہوتی ہے کہ اتنا شدید ردعمل ہوتا ہے، آپ کے خلاف پروپیگنڈا ہونا شروع ہو جاتا ہے، علمی و فکری گفتگوؤں کے بجاے ایک طوفان بدتمیزی اٹھا دیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آپ کا دائرۂ اثر چھینا جا رہا ہے۔

یہ ساری قیادت اصل میں آپ کے دائرۂ اثر پر قائم ہوتی ہے۔ قیادت لوگوں کی کی جاتی ہے۔ اگر معلوم ہو کہ آپ کی زیر قیادت سے آج بلال گئے، آج عمار گئے، آج عمر گئے، آج ابوبکر رضی اللہ عنہم گئے تو پھر کون ہے جس کی آپ کو قیادت کرنی ہے۔ یہ اس لیے گئے کہ جو دعوت پیش کی گئی ہے، اس سے یہ متاثر ہو رہے ہیں۔ چنانچہ درحقیقت پیغمبر کے آنے کے بعد یا کسی مصلح کے کھڑے ہونے کے بعد قیادت کے معیارات ہی تبدیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اس لیے سب سے بڑا خطرہ قیادت ہی محسوس کرتی ہے۔ دانش ور اپنی دانش کے لیے اور سیاست دان اپنی سیاست کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ انھیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمیں چیلنج کریں یا نہ کریں، جب لوگ ہی نیچے سے نکلتے چلے جا رہے ہیں تو معلوم نہیں کہ کل ان کی قیادت کرنے کے لیے کون کھڑا ہو جائے گا۔

لہٰذا یہ خطرہ ہے جو سامنے آتا ہے، اس کو ایسے ہی دیکھنا چاہیے۔ کوئی پیغمبر لوگوں کو آ کر یہ نہیں کہتے کہ ہم انقلاب برپا کرنے کے لیے آئے ہیں تو اس لیے لوگ ان کے خلاف ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کی وہ دعوت ہے جس سے لوگ متاثر ہوتے ہیں[1]۔

---

[1] https://ghamidi.com/videos/does-islam-as-a-system-of-beliefs-address-the-individual-or-the-leadership-5876

دین اور رسم و رواج

سوال: کیا ہم نے دین، دینی فکر اور رسم و رواج کو خلط ملط کر دیا ہے؟

جواب: یہ بات بہت حد تک صحیح ہے کہ ہم نے دین، دینی فکر اور رسم و رواج کو خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ صرف ہمارے ساتھ نہیں ہے، بلکہ آپ اگر پوری دنیا کا مطالعہ کریں تو سب میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ انسان جب اپنے وجود کو سوسائٹی سے متعلق کرتا ہے تو ایک تو یہ ہے کہ کسی فلسفی نے کوئی نقطۂ نظر پیش کر دیا، اس کے مقابل آپ یہ چیز رکھ لیں کہ انبیا علیہم السلام نے لوگوں کے سامنے آ کر اللہ کی ہدایت کا ایک نقشہ بیان کر دیا۔ یہ چیز تو اپنی ذات میں یا کسی مفکر کے ذریعے سے پہنچی ہو گی یا کسی خدا کے پیغمبر کے ذریعے سے ملی ہو گی اور متعین اور واضح بھی ہو گی، لیکن اس کے بعد انسان ہی نے اس کو سمجھنا ہوتا ہے، یعنی اب تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہو سکا کہ آپ پورے کے پورے فکری سرمائے کو ایسی صورت دے دیں کہ اس میں تاویل یا تعبیر کی گنجایش ہی باقی نہ رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جیسے ہی کوئی فکر پیدا ہوتا یا کوئی ہدایت وجود میں آتی یا کوئی فلسفہ تشکیل پاتا ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر انسان اس پر بحث و مباحثہ اور غور و فکر شروع کر دیتا ہے۔ اب انسان جب یہ معاملہ کرتا ہے تو تعبیرات میں اختلافات بھی ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں خود فرماتے ہیں کہ جس وقت میں نے اس دنیا کی ابتدا کی تو ظاہر ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کے ذریعے سے ابتدا کی۔ آدم و حوا علیہما السلام، دونوں کو ان کے فطری شعور کی بنیاد پر ضروری ہدایات بھی دے دی گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی اولاد اور بعد میں آنے والے لوگوں کو وہی ہدایات منتقل کیں، لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ لوگوں میں اختلافات پیدا ہو گئے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۖ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرہ ۲: ۲۱۳)

”لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے اور اُن کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تا کہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔“

ابتدا میں کوئی مسئلہ نہیں تھا، لیکن لوگوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ اختلافات اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ

انسان اپنے اپنے زاویۂ نظر سے چیزوں کو دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ دو حوادث یا دو آفات بھی لاحق ہو جاتی ہیں:

قلت علم،

اور قلت تدبر۔

بعض اوقات کسی چیز کے لیے جتنا علم چاہیے، اس کے پاس وہ نہیں ہوتا، اس لیے قلت علم تعبیرات کے اختلافات کا باعث بن جاتا ہے۔ قلت تدبر یہ ہے کہ کسی چیز کا علم تو تھا، لیکن جس طرح ہر چیز سے الگ ہو کر غور و فکر کا حق ادا کرنے کی ضرورت تھی، وہ ادا نہیں ہوا۔ یہ چیزیں تو ہر انسان کے ساتھ کہیں نہ کہیں سے لاحق ہیں، لیکن خارجی عوامل، مثلاً تعصبات، مفادات، سیاست، معاشرت و معیشت کے مسئلے بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔ ماحول بھی اثر انداز ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے تعبیرات کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک چیز تو یہ ہے کہ کوئی فلسفہ، فکر یا اللہ کے پیغمبروں کی ہدایت متعین صورت میں آپ کے سامنے آگئی۔ آدم و حوا علیہما السلام کو اگر دس باتیں بھی بتائی گئی تھیں تو وہ متعین تھیں۔ اسی طرح تورات میں احکام عشرہ واضح ہیں۔ لہٰذا ایک واضح بات اللہ تعالیٰ کہہ دیتے ہیں، لیکن اب اس کے فہم کا معاملہ شروع ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ چیز وجود میں آتی ہے جسے آپ نے 'مذہبی فکر' (religious thought) سے تعبیر کیا۔ پھر اس کے ساتھ تاریخ وابستہ ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ ایک مسئلہ ہے کہ دنیا نے آگے بڑھنا ہے اور جو لوگ آج موجود ہیں، انھوں نے ماضی کا حصہ بننا ہے۔ تاریخ میں واقعات ہو رہے ہوتے ہیں، تاریخ میں انطباق ہو رہا ہوتا ہے اور تاریخ میں اطلاقی مسائل زیر بحث آ رہے ہوتے ہیں، تاریخ شخصیات کا نام بھی ہے۔ بڑی شخصیات سے انسان فطری طور پر متاثر ہوتا ہے اور ان کے ذہن اور سوچ سے سیکھنا شروع کرتا ہے تو تاریخ اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔

تاریخ کلچر کو وجود میں لے آتی ہے، یعنی جیسے ہی دنیا آگے بڑھتی ہے تو آپ کے رسوم و روایات اور ثقافت جیسی ساری چیزیں مل کر ایک ملغوبہ بن جاتا ہے۔ جب یہ ملغوبہ بن جاتا ہے تو ہر وقت اس کو الگ کر کے رکھنا کہ یہ حصہ دین ہے یا یہ کوئی فلاں فلسفے یا فکر کی اصل صورت ہے یا یہ چیز وہ ہے جس میں انسان نے اپنے آپ کو داخل کیا ہے یا یہ اس کا فہم (understanding) ہے اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی متعین کرنا کہ یہاں کلچر، یہاں تہذیب، یہاں روایات و رسوم اثر انداز ہو گئی ہیں، یہ مشکل کام ہوتا ہے۔ خود آپ کی اپنی شخصیت بھی تاریخی پس منظر ہی میں کھڑی ہوتی ہے۔ خود آپ بھی جو کچھ سیکھ چکے یا جو کچھ پا چکے ہوتے ہیں، شخصیات ہی

سے پاتے ہیں، اس لیے آپ کے اپنے پس منظر سے بھی نجات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ مشکل کام ہے۔[۲]

تصانیف

—— جاوید احمد غامدی

- البیان

قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر

- میزان

دین کی تفہیم و تبیین

- برہان

تنقیدی مضامین کا مجموعہ

- مقامات

متفرق تحریریں

- الاسلام

"میزان" کا خلاصہ

- خیال و خامہ

مجموعۂ کلام

۲-https://ghamidi.com/videos/the-issue-of-interpretation-ofreligion-part-1-3525

محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۳)

باب ۱۳

ادارۂ تدبر قرآن و حدیث

جب ''تدبر قرآن'' کا کام اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہا تھا تو امین احسن یہ کہا کرتے تھے کہ اس تفسیر کے بعد اگر عمر اور صحت نے اجازت دی تو اس طرح کی ایک کتاب حدیث پر بھی لکھیں گے۔ وہ اس بارے میں اپنے شاگردوں اور رفقا سے مشورہ بھی کرتے رہتے تھے۔ ان سب کی غالب راے یہی تھی کہ مولانا کو باقی عمر حدیث کے کام کے لیے وقف کرنی چاہیے۔ اس دوران میں جاوید احمد صاحب غامدی نے یہ تجویز دی کہ اس مقصد کے لیے ایک ادارہ قائم کر لیا جائے۔ چنانچہ امین احسن نے فیصلہ کیا کہ حلقۂ تدبر قرآن کو جو ان کی اور خالد مسعود صاحب کی نگرانی میں کام کر رہا تھا، وسعت دے کر ایک ادارہ کی شکل دے دی جائے اور آیندہ کام اس کے تحت کیے جائیں۔ یہ ادارہ ''ادارۂ تدبر قرآن و حدیث'' کے نام سے ایک دستور کے تحت یکم محرم ۱۴۰۱ھ کو محمد نعمان علی صاحب کی اقامت گاہ پر قائم ہوا۔ امین احسن اس کے صدر اور خالد مسعود صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے۔

اس ادارے کے تحت امین احسن نے ہفتہ وار درس قرآن کا وہی سلسلہ جاری رکھا جس کا آغاز ان کی گاؤں سے واپسی پر ہو چکا تھا۔ اس طرح انھوں نے ہفتہ وار نشست میں حدیث کے اصولوں پر لیکچر دیے، جو اس وقت ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ حدیث کے حوالے سے پہلے موطا امام مالک

اوراس کے بعد بخاری کا درس ہوا۔ موطا تو پوری پڑھائی گئی، مگر بخاری کا درس ۱۹۹۳ء میں معطل ہو گیا۔ ادارہ کی تحقیقات اور امین احسن کے دروس کی اشاعت کے لیے رسالہ ''تدبر'' جاری ہوا، جو ایک سلسلۂ منشورات کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔ اسی دور میں امین احسن نے فلسفے کے بنیادی مسائل پر قرآن کا نقطۂ نظر بیان کیا، جو ''فلسفہ کے بنیادی مسائل'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپا۔ اسی طرح ان کی کتاب ''تزکیۂ نفس'' شائع ہوئی۔

حواشی

امین احسن کی تمام کتابیں فاران فاؤنڈیشن شائع کرتا ہے، جس کے مالک ان کے شاگرد ماجد خاور صاحب ہیں۔ انھوں نے امین احسن کو کتب کے اشاعت کی پریشانیوں سے آزاد کیے رکھا۔

باب ۱۴

وفات

۱۹۹۳ء تک امین احسن کی عمومی صحت بہت اچھی تھی۔ اس کے بعد عارضۂ قلب کا شکار ہوئے۔ اس بیماری سے بھی نجات پالی تھی۔ ۱۹۹۳ء میں بڑھاپے کی کم زوری کے باعث ان کے دروس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۹ برس تھی۔ اس کے باوجود وہ علمی مسائل میں رہنمائی دیتے رہے، مگر ۱۹۹۵ء میں فالج نے حملہ کر دیا۔ اس کے بعد مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

عبدالرزاق صاحب اپنی ۱۸/ اکتوبر ۱۹۹۶ء کی ڈائری میں لکھتے ہیں:

> ''آج مولانا سے تقریباً ۲ سال بعد ملاقات کی۔ ملاقات کیا کی فقط ان کی زیارت ہی کی۔ مولانا کو دیکھ کر بے حد دکھ اور افسوس ہوا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ وہ نہایت کمزور اور نحیف ہو چکے ہیں۔ فالج کے حملہ کے بعد ان کی سماعت اور گویائی شدید متاثر ہوئی ہے اور اب بمشکل ہی پہچانتے ہیں۔
>
> خالد مسعود صاحب نے مولانا کو پشت سے تکیہ کی ٹیک دے کر بٹھائے رکھا۔ مولانا کبھی کبھی چہرہ اوپر کر کے ساتھیوں کو دیکھتے مگر اب ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ خود بڑی بے بسی محسوس کر رہے ہیں۔ مولانا کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے سامنے صدی کا

سب سے بڑا مفسرِ قرآن تھا جو اب نہ خود حرکت کر سکتا تھا نہ اپنے اظہار کے لیے بولنے پر قادر تھا۔ ایسی بے بسی، ایسی مجبوری.....! مولانا کے پاس ہم آدھا گھنٹہ بیٹھے رہے۔"(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۹)

۱۹۹۷ء میں مرض میں اضافہ تو رک گیا، مگر نقاہت بڑھتی چلی گئی۔ اس کے باوجود خاص اعزہ، احباب اور شاگردوں کو پہچانتے، ان کے ساتھ بات کرتے، انھیں خوش آمدید کہتے اور انھیں الوداع کہتے تھے۔ اپریل ۱۹۹۷ء میں ان کے شاگرد خالد مسعود حج کر کے وطن لوٹے تو ان کے پاس حاضر ہوئے اور مصافحہ کر کے بیٹھنے لگے تو امین احسن نے معانقہ کے لیے فوراً ہاتھ اٹھا دیے کہ حاجیوں سے ملنے کا یہی دستور ہے۔ نومبر میں ان کی غذا بہت کم ہو گئی۔ نقاہت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ لوگوں کو پہچاننے میں مشکل پیش آنے لگی۔ بات کرنا بھی کم و بیش ناممکن ہو گیا۔ جسم تیزی سے گھلنے لگا۔

عبدالرزاق صاحب کی ۱۵/ جون ۱۹۹۷ء کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے:

"آج ادارہ کے اراکین کے ساتھ مولانا اصلاحی صاحب کی عیادت کے لیے گیا۔ اکتوبر ۹۶ء میں مولانا کی جو حالت تھی اس کی نسبت اب وہ کافی بہتر تھے۔ صحت بھی اچھی لگ رہی تھی۔ انہوں نے ساتھیوں کو پہچان لیا قوتِ گویائی متاثر ہونے کی وجہ سے وہ مدعا بیان نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنا چاہتے تھے اور کوشش بھی کی مگر اس کا سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ بس اونچی آواز سے کچھ کہہ دیتے ہیں جسے سمجھا نہیں جا سکتا۔"(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۹)

۱۸/ جولائی ۱۹۹۷ء کو دوپہر سوا گیارہ بجے راقم بھی کچھ احباب کے ساتھ امین احسن کی عیادت کے لیے گیا تھا۔ ہماری گاڑی اصلاحی صاحب کے گھر کے سامنے دوپہر سوا گیارہ بجے رکی۔ ہم ایک بیرونی اور ایک اندرونی دروازے سے گزرے۔ پھر سیڑھیاں اتر کر اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں صاحب —— "تدبر قرآن" صاحب فراش تھے۔ وہ بالکل سیدھے لیٹے سو رہے تھے، لیکن عینک بدستور لگی ہوئی تھی۔ وہاں موجود اصلاحی صاحب کے نواسے، معاذ نے سوچا کہ یہ عینک نانا ابو کو تکلیف نہ دے رہی ہو، وہ آگے بڑھا اور بڑی آہستگی سے عینک اتارنے لگا۔ ابھی اس نے عینک کو ذرا کھینچا ہی تھا کہ امین احسن جاگ گئے —— ہاں انھیں جاگ ہی جانا چاہیے تھا۔ منذرین کو کھٹکے کی نیند ہی سونا چاہیے —— امین احسن نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے آگے بڑھ کر باری باری مصافحہ کیا۔ امین احسن نے ہم سب کے چہرے پر اس طرح ہاتھ پھیر کر پیار کیا، جس طرح ایک باپ اپنے بچے کو پیار کرتا ہے۔ امین احسن ہمارے باپ ہی تو ہیں، معنوی باپ، بلکہ روحانی باپ۔ حقیقی والدین ہمیں عدم سے وجود میں لانے کا ذریعہ بنے اور اصلاحی صاحب ہماری فکر پر عرفان کی راہیں کھولنے کا وسیلہ بنے۔

آ...آپ...کا...حال؟امین احسن نے اس طرح یہ الفاظ ادا کر کے ہماری خیریت دریافت کی۔ان کی قوت سماعت کی کم زوری کے باعث ہم نے اشارے سے کہا: ہم سب خیریت سے ہیں۔

پھر معاذ نے نانا جان کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ امین احسن کئی قسم کے امراض میں مبتلا ہیں۔ ایک مرض کی تفصیل بتاتے ہوئے معاذ نے کہا کہ ان کا خون اتنا پتلا ہو چکا ہے کہ ٹیکہ لگانے کے بعد اسے پٹی باندھ کر روکنا پڑتا ہے۔ وہ خود جم کر نہیں رکتا۔ ایسی حالت میں کسی عام آدمی سے اس کا حال پوچھیں تو وہ آہیں بھرتے ہوئے اپنی تکلیفوں کی ایک فہرست گنوا دے گا۔ خدا اور خدائی سے شکووں اور شکایتوں کا دکھڑا روئے گا، مگر جب معاذ نے آپ سے پوچھا: نانا ابو، آپ کو اس طرح بیٹھنے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی؟ تو امین احسن نے جواب دیا:

یہاں (اس دنیا) کی... تکلیف بھی... آرام دہ ہے۔

امین احسن کی زبان کچھ رواں ہو گئی تھی۔ وہ الفاظ کو ایک حد تک صحیح ادا کرنے لگے تھے۔ میں نے اسے موقع غنیمت سمجھا اور معاذ سے کہا: انھیں کہیں کہ ہمیں کوئی نصیحت کریں...امین احسن نے ہمیں نصیحت کرتے ہوئے کہا:

صبر کریں...(دوسروں کو آرام دیں)...دوسروں کے آرام سے آرام ملتا ہے۔

امین پونے دو سال سے بستر سے لگے ہوئے تھے۔ چارہ گروں کا کہنا تھا کہ وہ اب اسی حالت میں رہیں گے۔ اس کیفیت میں انھوں نے صبر کا لفظ استعمال کیا، جس سے ظاہر ہے کہ یہاں صبر سے مراد عجز اور مسکنت نہیں، جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہوتا ہے، بلکہ اس سے مراد مصائب و شدائد میں اپنے آپ کو گھبراہٹ اور مایوسی سے بچا کر بندگی رب پر قائم رکھنا اور ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہے۔

چنانچہ دیکھیے بڑھاپے اور خرابی صحت کی اس حالت میں بھی اصلاحی صاحب کے قول اور فعل میں مطابقت کا عالم: معاذ نے بتایا عموماً جب اذان ہوتی تو نانا ابو کانوں کے قریب ہاتھ لا کر نیچے کر لیتے تھے۔ اس دوران میں ہم ان سے کوئی بات کرتے تو وہ جواب نہ دیتے، جس پر ہم گھبرا جاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت نانا ابو (اشاروں سے) نماز پڑھ رہے ہوتے تھے۔

ایک موقع پر ہم نے معاذ سے پوچھا کہ اصلاحی صاحب کی اس وقت ٹھیک عمر کیا ہے؟ تو معاذ نے غیر یقینی لب و لہجے میں سوچتے ہوئے کہا: ۹۳ یا ۹۴ سال۔ پھر ٹھیک ٹھیک عمر جاننے کے لیے اس نے پوچھا: نانا ابو آپ کی تاریخ پیدایش کیا ہے؟ امین احسن نے سوچتے ہوئے کہا:

... سن...

پھر ساری زندگی خود نمائی سے گریز کرنے والے اصلاحی صاحب نے قدرے بے زاری سے کہا:

''کیا کرو گے پوچھ کے!''

اس دل نواز ملاقات سے ہم سب کی طبیعت شاد ہو گئی۔ جب ہم ان کے گھر سے باہر نکلے تو اصلاحی صاحب کے ہاتھوں کا شفیقانہ لمس اور ان کی حکیمانہ باتوں کا ''اثاثہ'' ہمارے ساتھ تھا۔ اس موقع پر صاحب ''تدبر قرآن'' نے ہمیں دوسروں کو آرام دینے کی نصیحت کی۔

عبد الرزاق صاحب اپنی ۱۰/ اگست ۱۹۹۷ء کی ڈائری میں لکھتے ہیں:

''مولانا کو میں نے سہارا دے کر اٹھایا اور کمر کے پیچھے تکیہ رکھ دیا۔ اس دوران مولانا زور سے اپنے دانتوں کو رگڑتے رہے۔ شاید انھیں دانتوں میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر شہباز (حلقے کے رکن) کہنے لگے کہ شاید انہیں اس طرح کرنے سے سکون ملتا ہو، بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے مولانا کے ہاتھ کی انگلیاں جڑ سی گئی ہیں۔'' (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۹)

۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۷ء کی ڈائری میں عبدً الرزاق صاحب نے لکھا:

''مولانا نے جب ساتھیوں کو دیکھا تو بڑی مشکل سے فقط... آ... پ...!!! ہی کہہ سکے۔ کسی نے ملازم سے پوچھا کہ مولانا کھانے پینے میں ضد تو نہیں کرتے۔ ملازم نے جواب دیا کہ جب بھی مولانا سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیا کھائیں گے تو وہ بس یہی جواب دیتے ہیں ''جو مل جائے۔'' (سہ ماہی تدبر اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۹۰)

امین احسن کی حالت بہت تشویش ناک ہو چکی تھی۔ ہر وقت دھڑکا رہتا تھا کہ کوئی بھی جھونکا ان کا ٹمٹماتا ہوا چراغِ زندگی بجھا سکتا ہے، اور ایسا ہی ہو گیا۔

۱۵/ دسمبر ۱۹۹۷ء صبح ۳ بجے محفل صداقت کی یہ شمع بجھ گئی۔ ''امین فراہی'' فراہی کی امانت اس کے مستحقین تک پہنچا کر اپنے مالک کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ ان دنوں امین احسن ڈیفنس لاہور میں اپنے بیٹے ابو سعید اصلاحی صاحب کے گھر میں مقیم تھے۔ اسی دن صبح اور پھر دوپہر کے وقت ہم کچھ احباب ان کے گھر گئے۔ وہاں تعزیت کے لیے آنے والے مرد حضرات کو اسی کمرے میں بٹھایا جا رہا تھا جہاں امین احسن درس قرآن اور درس حدیث دیا کرتے تھے۔ وہاں بیٹھے ہوئے بار بار مجھے ان کی باکمال شخصیت کے مختلف پہلو یاد آ رہے تھے، ان کا مسکراتا ہوا سرخ و سفید چہرہ ان کی سوچتی ہوئی آنکھیں، ان کے چمکتے ہوئے بال... ان کی مشکلات قرآن کی

عقدہ کشائی، ان کی پیچیدہ احادیث میں واضح رہنمائی، ان کی نحوی مسائل میں باریک بینیاں، ان کی سیاسی امور میں نکتہ آفرینیاں... ان کی معنی خیز لطیف طنز... ان کے بے لاگ گہرے تبصرے... ان کی سلطانی پر فائق دہقانی... ان کا اقتدار کے ایوانوں سے استغنا... ان کا شدائد و مصائب میں صبر و ثبات۔ آہ! یہ باتیں اب محض یادیں ہیں۔

اس کمرے میں جہاں ہمیں بٹھایا گیا تھا، امین احسن کی افسردہ صلبی اور روحانی اولاد بیٹھی، اپنی اپنی چشم تصور سے اپنے باپ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ ان کی روحانی اولاد آنسوؤں سے بوجھل آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ باتیں کر رہی تھی:

''ایک دور ختم ہو گیا''... ''وہ ٹوٹ کر محبت کرنے والے تھے''... ''ان کے خلوص میں بہت گہرائی تھی''... بسا اوقات وہ بچوں کی طرح معصوم لگتے تھے''... وہ رات ۳ بجے کے قریب فوت ہوئے۔ یہ ان کا پسندیدہ وقت تھا۔ اس وقت وہ خدا کے حضور گریہ وزاری کیا کرتے تھے''... ''وہ اس قدر کم زور ہو چکے تھے کہ جسم پر گوشت نظر نہیں آتا تھا۔ بس ہڈیاں اور جلد دکھائی دیتی تھی۔''... ''دعا کریں، خدا اس چیز کو ان کے لیے کفارہ بنا دے''... ''بیماری میں بھی ان کا لب ولہجہ بہت حوصلہ افزا ہوتا تھا''... ''وہ جزع فزاع کرنے والے آدمی نہیں تھے۔''... ''حال پوچھیں تو بسا اوقات کہتے: بہت اچھا ہے''... ''وہ صبر کا پہاڑ تھے۔''

انھوں نے جب اپنا رسالہ ''میثاق'' جاری کیا تو انھیں کسی کی تحریر کم ہی پسند آتی تھی، اس لیے شروع شروع میں رسالے کے سارے مضامین خود ہی تحریر کیا کرتے تھے... وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۷ء میں وفات پائی۔ ان کا کام ایک صدی پر محیط ہے۔

اس میں کیا شبہ ہے کہ بیسویں صدی درحقیقت علم و عرفاں کے اعتبار سے فراہی و اصلاحی کی صدی ہے، بلکہ ایسے محسوس ہوتا ہے، جیسے اب ہر صدی انھی کی صدی ہے۔ دراصل ان ہستیوں نے علم و تحقیق کے سمندر کی تہ سے، جو گوہر نایاب تلاش کیے ہیں، وہ ایسے گوہر ہیں جو ہر صدی میں چمکتے، دمکتے اور اپنی اہمیت منواتے رہیں گے۔ ان کا کام ایک ایسا مضبوط درخت ہے جو ہمیشہ پُربہار، پُراثمار اور گل و گلزار رہے گا۔

اسی کمرے میں، جہاں ہم تعزیت کے لیے بیٹھے ہوئے تھے، ایک خوب صورت شیلف میں ''تدبر قرآن'' کی تمام جلدیں ایک ترتیب سے پڑی ہوئی تھیں، جلد پر چھپے ہوئے سنہری الفاظ ''تدبر قرآن'' سے کمرے کے قمقموں کی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ خدا کرے، قیامت میں ''صاحب تفسیر'' کے گرد اسی طرح روشنی کا ہالہ ہو!

جب تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو ہم گھر کے لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

میں بھی ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک سب لوگ ایک طرف دیکھ کر کھڑے ہو گئے، میں نے اس طرف دیکھا۔ اس طرف سے کبھی اصلاحی صاحب کو ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے، کبھی مسکراتے ہوئے اور کبھی سوچتے ہوئے باہر آتے دیکھا تھا۔ اب وہیں سے ان کا جنازہ آ رہا تھا... آخرت کی تذکیر کرنے والا سفر آخرت پر جا رہا تھا۔

لوگ جنازے کو کندھا دینے کے لیے بے تابی سے لپکے، گیٹ کے قریب صحن میں جنازہ آخری دیدار کے لیے زمین پر رکھ دیا گیا۔ میں بھی ہجوم کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جنازے کے قریب پہنچا، کفن میں لپٹا ہوا شہر بیدار کا سردار ابدی نیند سو رہا تھا۔

قریبی مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نمایاں شخصیات میں خالد مسعود صاحب، جاوید احمد صاحب غامدی، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، مصطفیٰ صادق صاحب، مجیب الرحمٰن شامی صاحب اور عطاء الرحمٰن صاحب نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ قاضی حسین احمد صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ وہاں دیگر جماعتوں کی بہ نسبت جماعت اسلامی کے اکابرین سب سے زیادہ تھے، حالاں کہ امین احسن نے جماعت اسلامی پر بہت سخت تنقید کی، لیکن یہ ان کی شخصیت اور ان کے کام کی عظمت تھی کہ جماعت اسلامی کے اکابرین کے دلوں میں آپ کے ساتھ عقیدت ہمیشہ قائم رہی۔

پھر ایمبولینس کے ذریعے سے ڈیفنس ہی کے ایک قبرستان کی طرف جنازہ لے جایا گیا... اتفاق سے ایک درخت کے سایے میں قبر بنائی گئی تھی۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر ایسے محسوس ہوا، جیسے دستِ قدرت، رحمت بن کر اصلاحی صاحب کے اوپر سایہ کیے ہوئے ہو۔ پھر امین احسن کا جسد خاکی اٹھایا گیا اور اہل زمیں کے ایک محسن عظیم کو زمین میں اتار دیا گیا۔ آہ:

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

کچی قبر بنی، قبر پر پانی چھڑکا گیا اور پھر قبر پر پھول بکھیر دیے گئے، لیکن ان پھولوں کی خوشبو اس خوشبو کی بہ نسبت بہت عارضی اور بہت محدود تھی جو خوشبو امین احسن نے اپنے قلم، اپنی زبان اور اپنے کردار سے پھیلائی۔

امین احسن کی وفات پر مدرستہ الاصلاح اور ادارہ علوم القرآن میں منعقد ہونے والے تعزیتی اجلاس کی رودادیں حسب ذیل ہیں:

> ”منعقدہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر ۱۶/ دسمبر ۱۹۹۷ء بمطابق ۱۵ شعبان ۱۴۱۸ھ یہ خبر کہ مدرستہ الاصلاح کے گل سر سبد معروف مفسر قرآن، ترجمان فراہی، جناب مولانا امین احسن اصلاحی طویل علالت کے بعد کل ۱۴/ شعبان ۱۴۱۸ھ وقت سحر اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ یہ خبر صحن مدرستہ الاصلاح میں

بجلی بن کر گری جس سے مدرسہ کے چپہ چپہ پر غم والم کی دبیز کہر چھا گئی۔ سالانہ امتحان اور دوسری تمام مصروفیات یک لخت ملتوی کر دی گئیں اور مدرسہ کی وسیع مسجد میں اساتذہ، طلبہ اور ذمہ داران جمع ہوئے، مولانا کی عظیم علمی و قرآنی خدمات کو یاد کیا۔ انھیں خراج تحسین پیش کیا، اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور حسب ذیل قرار داد منظور کی:

۱۔ مدرستہ الاصلاح کے اساتذہ و طلبہ کا یہ اجلاس مدرسہ کے اس عظیم فرزند اور فقید المثال مفسر قرآن، جانشینِ فراہیؒ مولانا امین احسن اصلاحی کی وفات حسرت آیات پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

۲۔ یہ اجلاس کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے کہ مولانا مرحوم مدرستہ الاصلاح کے لیے سرمایۂ افتخار تھے اور ہیں۔ قحط الرجال کے اس دور میں مولانا مرحوم نے فکر فراہی کی روشنی میں علمی، قرآنی، فکری، تحقیقی، تصنیفی، دعوتی، تحریکی، تعلیمی اور سیاسی میدان میں جو بے مثال خدمات انجام دی ہیں اور ایک خاص نہج عطا کیا ہے وہ ملت اسلامیہ کے لے نہ صرف قیمتی متاع اور قابل قدر سرمایہ ہے بلکہ ایک ایسا منارۂ نور ہے جس سے ملت اسلامیہ کے اہل علم وفکر صدیوں کسب نور اور اخذ واستفادہ کرتے رہیں گے۔

۳۔ مولانا مرحوم آسمان علم و تحقیق کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ان کی وفات سے علمی دنیا پر تاریکی سی چھا گئی ہے اس لئے مولانا کا سانحۂ ارتحال نہ صرف مدرستہ الاصلاح بلکہ عالم اسلام کا ناقابل تلافی نقصان اور عظیم حادثہ ہے۔

۴۔ یہ اجلاس بارگاہ خداوندی میں اشکبار آنکھوں اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی عظیم خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے۔ ان کی مغفرت فرمائے۔ انہیں اعلیٰ علیین میں شہداء وصدیقین کی صف میں جگہ دے۔ ان کی وفات سے ملت اسلامیہ کا جو عظیم خسارہ ہوا ہے اس کی تلافی کی سبیل پیدا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین!

منجانب

اساتذہ و کارکنان و طلبہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر

منعقد ادارۂ علوم القرآن سر سید نگر علی گڑھ

ادارۂ علوم القرآن (سر سید نگر، علی گڑھ بھارت) کے زیر اہتمام ۱۸/ دسمبر کو ایک تعزیتی نشست زیر صدارت پروفیسر اشتیاق احمد صاحب (مولانا امین احسن اصلاحی کے بھتیجے) منعقد ہوئی جس میں ادارہ کے

متعلقین کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے متعدد اساتذہ وطلبہ شریک ہوئے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ریڈر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ابتدائی کلمات کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر روشنی ڈالی اور ان کی قرآنی خدمات کا جائزہ لیا۔ آپ نے فرمایا: ''مولانا کا انتقال نہ صرف ان کے اعزہ واقربا، متعلقینِ مدرستہ الاصلاح اور وابستگان تحریک اسلامی کے لئے بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لے ایک عظیم سانحہ ہے۔ مولانا نے پورے ۷۵ سال تک قرآنی علوم اور تحریک اسلامی کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ مولانا فراہیؒ کے انتقال کے بعد ان کے تشکیل کردہ خطوط پر مولانا مدرسہ کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اس فکر کی توسیع واشاعت کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے۔ مولانا فراہیؒ کے تفسیری اجزاء کے ترجمہ، الاصلاح کی ادارت، دائرۂ حمیدیہ کی علمی سرگرمیوں، تحریک اسلامی کی قیادت اور اس کے علاوہ بھی مولانا نے بہت سی علمی ودینی خدمات انجام دیں۔ قرآن مجید، حدیث، فقہ، تاریخ اسلامی، اسلامی ریاست، اور ان کے علاوہ دوسرے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ درس وتدریس، مذاکرہ ومباحثہ، تحقیق وتصنیف، غرض کہ ہر ممکن ذریعہ سے قرآنی فکر کو عام کرنے کی کوشش کی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن سے وابستگی، قرآنی علوم سے لگاؤ، قرآنی فکر کو پروان چڑھانے کا بے پناہ جذبہ مولانا کی ذات کا خاصہ تھا۔ ان کی یہ قرآنی خدمات ہمارے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی لیکچرر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جنھوں نے متعدد بار پاکستان کا سفر کیا ہے اور مولانا سے ملاقات وگفتگو کا شرف بھی ان کو حاصل رہا ہے اور اس بنا پر یہ بات فطری ہے کہ ان کے اوپر اس سانحہ کا اثر زیادہ تھا، کچھ زیادہ تھا، کچھ زیادہ گفتگو نہ کرسکے البتہ آپ نے مولانا سے اپنی ملاقاتوں کے حوالہ سے چند واقعات کا بطور خاص ذکر کیا جن سے مولانا کی وسیع الجہات شخصیت کے کئی نمایاں گوشے ابھر کر سامنے آئے۔ آپ نے کہا کہ آخر وقت میں مولانا مرحوم اپنے وطن اعظم گڑھ آنے کے لیے بہت مضطرب اور بے چین رہا کرتے اور مدرستہ الاصلاح آنے کا ہر وقت خواب دیکھا کرتے تھے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح مدرستہ الاصلاح پہنچ جائیں۔ مدرسہ اور متعلقین مدرسہ کا ذکر ہوتا تو مولانا آبدیدہ ہو جاتے۔ ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی ریڈر شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے صرف دو عظیم شخصیتوں سے ملنے کی خواہش تھی۔ ایک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور دوسرے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ذات گرامی تھی۔ مولانا مودودیؒ سے ملنے پاکستان جانا ہوا مگر اس وقت وہ بیمار تھے اور ان

سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ دوسرے سفر میں مولانا امین احسن اصلاحی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، مگر اس وقت جب مولانا بالکل معذور ہو چکے تھے۔ مولاناؒ نے پاکستان میں قرآن فہمی اور فکر فراہی کا ایک بڑا حلقہ قائم کیا ہے اور متعدد ادارے اس فکر کو پروان چڑھانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق احمد ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صدر ادارۂ علوم القرآن اور مدیر مجلہ علوم القرآن نے بھی مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا آج ہمارے سر سے ایک سایہ تھا جو اٹھ گیا۔ ہم اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مدرستہ الاصلاح کو ایک علمی مرکز کی حیثیت دینا، وہاں علمی مزاج پیدا کرنا، باصلاحیت شاگردوں کا ایک حلقہ قائم کرنا جو اس فکر اور اس کام کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتے تھے، مولاناؒ کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مولانا اپنے زمانہ کے زبردست خطیب و مقرر تھے۔ مدرستہ الاصلاح کے اطراف میں اصلاح معاشرہ کی جو تحریک چل رہی تھی اس میں مولانا کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی رکن ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ نے فرمایا کہ مولانا نے قرآنی علوم کی یکہ و تنہا جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ ایک شخص کا نہیں، ایک اکیڈمی کا کام ہے۔ مولانا کا کام بہت ہی منظم اور اوریجنل ہے۔ مولانا ایک عظیم مفکر اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مولانا کے کارنامے ہمہ جہتی ہیں۔ مترجم، مفسر، خطیب، ادب شناس ہونے کے علاوہ بے شمار دوسرے کمالات ان کی ذات میں جمع تھے۔ اللہ نے ان کو توفیق دی کہ انھوں نے تاحیات ان صلاحیتوں کو اللہ ہی کی راہ میں کھپا دیا۔ ان کا حق ہے کہ آئندہ ان کی شخصیت اور خدمات پر ریسرچ و تحقیق کا کام ہو اور ان کے منصوبوں کو آگے بڑھایا جائے جو ان کو زندگی بھر عزیز رہے۔ تدبر قرآن ان کی شاہکار تفسیر ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے تدبر قرآن کا کام ساٹھ سال کی عمر میں اس وقت شروع کیا جب کہ عام لوگ اس عمر میں تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ مولانا ہی کا حوصلہ اور عزم تھا کہ اس کو مکمل کر کے اپنے استاد کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے عز و جاہ اور مالی منفعت سے بے نیاز ہو کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ لائق تقلید اور قابل رشک ہے۔ اصلاحی برادری پر فرض ہے کہ اس کام کو آگے بڑھائے۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا جیسی شخصیتیں خاندان، وطن، ادارے اور رشتوں ناتوں سے بالا ہوا کرتی ہیں۔ مولانا مرحوم پوری انسانیت اور پوری کائنات کی میراث ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی حالیہ ۳۰؍ اکتوبر ۹۷ء کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ مولانا کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

آپ نے فرمایا کہ ستر برس سے زیادہ تصنیف وتالیف کا کام کرنا خود بہت بڑا کارنامہ ہے۔ پاکستان میں مولانا نے متعدد قرآنی حلقے قائم کیے اور پیغام ربانی کو ہر خاص وعام تک پہنچایا۔ پاکستان کے خواص وعوام ہر ایک مولانا کا عقیدت مند ہے مولانا کے درس قرآن میں ہمیشہ شرکاء کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا، جس کے ذریعہ سے انہوں نے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی نے بھی اپنے احساسات وجذبات ظاہر کیے اور بالخصوص تحریک اسلامی کے حوالہ سے ان کی خدمات کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا۔ آخر میں مولانا عمید الاسلام قاسمی صاحب نے جو مولانا مرحوم کے ایک گہرے معتقد ہیں، اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور انھی کی دعا پر نشست کا اختتام ہوا۔ یہ نشست بعد عصر سے عشاء کے قریب تک چلی۔ درمیان میں مغرب کے لیے وقفہ رہا۔ ادارۂ علوم القرآن کی جانب سے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ ان شاءاللہ مولاناؒ کے مشن کو جاری وباقی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ علوم القرآن کا آئندہ شمارہ ان شاءاللہ مولانا امین احسن اصلاحی نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ صدر ادارہ نے یہ امید ظاہر کی کہ اہل علم، بالخصوص قرآنیات سے دل چسپی رکھنے والے، اس عظیم منصوبہ کی تکمیل میں اپنا تعاون پیش کریں گے۔''

(ترتیب: اشہد رفیق ندوی، سکندر علی اصلاحی)

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ۱۰۶-۱۰۹)

Monthly
ISHRAQ
Lahore

October 2024
Vol.36 No.10
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ’’اشراق‘‘ کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ’’اشراق‘‘ کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ’’اشراق‘‘ کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ’’اشراق‘‘ کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ وتفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق